© rasailojaraid.com

عکسِ تحریر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عکسِ تحریر

تاریخ ادب اردو - جلد اول - اس میں شروع سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کی اردو ادب کی تاریخ بیان کی گئی ہے - اشاریہ ۲۱۲ صفحات بڑے سائز کے ہیں - تمہید بھی ہے اور اس سے پہلے "پیش لفظ" ہے جس میں اس جلد کا خاکہ اسی لیے کہ ساری تصنیف کو، ترتیب زمانی سے، چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے - ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں سب سے پہلے ہر فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی، معاشرتی اور ادبی و لسانی امور کا اجاگر کیا گیا ہے ... (پھر) اس دور کے ممتاز و نمائندہ شاعروں اور ادیبوں کے ذہن و اثرات اور ان کی تخلیقی کاوش کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔" یہ ہے گویا اس طرح پہلی جلد کی ترتیب ہے - پھر تمہید سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو گوشوں کا سب سے پہلے اردو زبان اور اس کی نشو و نما کے اسباب اور حالات بیان کیے ہیں اور اس کے متعلق جو مختلف نظریے ہیں ان پر تنقید کی ہے - زبان کس طرح شروع ہوئی اور کس طرح بڑھ کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچی؟ اس کے اسباب اور تاریخی واقعات کیا ہیں! ان سب کی تفصیل ہے اور تمہید کے آخر میں فرمایا ہے کہ "زبان کا مولد تو شمال ہے لیکن تہذیبی تقاضوں کے تحت اس نے ادبی زبان کا درجہ، شمال سے صدیوں پہلے، گجرات و دکن میں حاصل کر لیا تھا۔" (صفحہ اسی و) پھر فصل اول شروع ہوتی ہے جس کے باب اول میں ۱۰۰۰ء سے ۱۵۲۵ء تک کے تاریخی واقعات کا اجمال ہے اور اس قدر میں (۱) مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی سے لے کر گرو نانک کے عہد تک جو الفاظ و اقوال ہماری زبان سے متعلق ملتے ہیں ان کا ذکر ہے - دوسرے باب میں بابر سے شاہجہاں تک کے عہد کے اور تیسرے باب میں اورنگ زیب کے زمانے کے ایسے اقوال درج ہیں اور لغت کے سلسلے میں صحیح فرمایا ہے کہ "کسی زبان میں لغت کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب وہ ارتقاء کی منازل طے کر کے ادبی اور علمی سطح پر استعمال کی جانے لگی ہو" (صفحہ ۷۸) -

۱ - بعض صفحات سے متعلق معروضات ہیں :- (صفحہ ۷) بین الاقوامی (یا رابطے کی) زبان؟

(صفحہ ۱۴-۱۵ وغیرہ) - برِ عظیم (یا برِ صغیر)

(صفحہ ۲۲) راشٹری کے ساتھ پانڑی بھی مشہور لفظ ہے جس میں سے کری نکالا گیا ہے -

(صفحہ ۲۳) محمد عوفی نے یہی بات دہرائی ہے - محمد عوفی تو امیر خسرو سے پہلے ہو گئے ہیں وہ کیسے دہرائیں گے؟ سبحان رائے تو اورنگ زیب کے زمانے کا ہے جس نے امیر خسرو کی "زبانِ پنجاب" کو زبانِ ہندوار کہا ہے -

(صفحہ ۲۶) تاج الدین کی مفتاح القلوب کا سالِ تصنیف؟

(صفحہ ۲۹) فن لغت پر مثلثات قطرب سے پہلے خلیل ابن احمد کی کتاب العین لکھی گئی تھی جو چھپ گئی ہے -

(صفحہ ۳۱) محمد حسین آزاد نے خالق باری پر کوئی محققانہ نظر نہیں ڈالی اس لیے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں

(صفحہ ۳۱) وصالی کا سالِ وفات؟

(صفحہ ۳۲) نہ سپہر کا شعر کچھ سہو کا شکار ہو گیا ہے -

(صفحہ ۳۴) "تحقیق سے معلوم ہوتا ہے" - کس کی تحقیق سے؟

(صفحہ ۳۷) دوہا نہ سائیں سیرت (سرت بمعنی جسمی) - اساکیری (سطر ۷) اسان گیری - چاہیے -

(صفحہ ۳۷) جمعات شاہی کا پورا حوالہ چاہیے - کب اور کس نے جمع کی ہے -

۲ - صفحہ ۴۲ (سطر ۳) - لفظ کو توال، سنائی نے نہیں بلکہ فردوسی نے استعمال کیا ہے - حافظ محمود شیرانی نے اسے نقل کیا ہے :- ع جو آگاہ شد کو توال حصار پہلی اور سے متعلق خالق باری بھی ہے - شیرانی مرحوم نے اسے ایک مؤخر خسرو کی تصنیف ثابت کیا تھا - ڈاکٹر جمیل جالبی اسے امیر خسرو ہی کی تصنیف ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں اضافے اور تحریفات ہیں جن کی وجہ سے وہ امیر خسرو کی نہیں سمجھی گئی - اسی سلسلے میں مطبوعہ الفبان کا ذکر بھی ہے جو حمدی کی ہے - اسی حمدی کا ایک شعر باغ و بہار میں آیا ہے جس کے متعلق مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ اگر وہ کتاب امیر خسرو کی ہوتی تو وہ حمدی کا شعر کیوں لکھتے؟ - اسی اور سے متعلق بابا فرید شکر گنج کا کلام بھی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا ہے - کچھ اور ادبی ملتے ہیں جو راقم الحروف کی کتاب "فارسی پر اردو کا اثر" میں نقل ہوئے ہیں - صفحہ ۵۲ (سطر ۱۲) میں مصرع اس طرح ہوگا :- انگشت رقیب شد برار ا

صفحہ ۷۹ میں خفقہ ہندی کا ذکر ہے - شیرانی مرحوم نے اس کے ایک نسخے کے خاتمے میں "عبداللہ انصاری" لکھا ہوا دیکھا تھا - لیکن انصاری اضافہ معلوم ہوتا ہے - عبداللہ عبدی صحیح ہوگا - تفصیل کے لیے راقم الحروف کی کتاب "تحریر و تقریر" (صفحہ ۱۷۶) ملاحظہ فرمائیں -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فصل دوم میں گجری ادب، اُس کی روایت، تاریخ اور نمونے دیے گئے ہیں۔ لیکن نمونے کم ہیں۔ تاہم "روایت" کا تعین بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اور بالخصوص نجم الفضائل سے ایسے الفاظ کا اچھا ذخیرہ حاصل کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "اردو زبان و ادب پر چھٹی صدی ہجری سے لے کر دسویں صدی ہجری تک ہندوی روایت ہی کی حکمرانی رہی ہے" اور یہ "ہندوی روایت" مختلف علاقوں کی زبانوں سے مل کر علاقائی روایت بھی بن جاتی ہے جس کے تعین کی (صفحہ ۱۰۵) ڈاکٹر صاحب نے کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

• گجری اردو کے اپنے مخصوص اوزان تھے۔ اُس کی اپنی ہیئت تھی جس میں دوہرے، عقدہ، مکاشفہ اور چین شامل تھے۔ تصوف و اخلاق کے موضوعات کو موسیقی کی مختلف راگ راگنیوں کے مطابق، شاعری کی زبان میں ترتیب دینے کی روایت تھی (صفحہ ۱۳۰) پھر خود اعتراف کرتے ہیں کہ "اگر اس دور کے گجری ادب کو دکنی ادب میں ملا دیا جائے تو ایک کو دوسرے سے شناخت کرنا مشکل ہوگا" یہ بات دسویں صدی ہجری کے اواخر کے اثرات کے متعلق آپ نے لکھی ہے لیکن یہی بات زبان سے متعلق، اس سے پہلے کے دور میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لیے لسانی ارتقا سے متعلق یہ بات قطعی طور پر نہ کہی جا سکتی کہ دکنی زبان و ادب پر گجری اثرات ہی غالب ہوئے جب کہ خود دکنی زبان اس دور میں قریب قریب گجری ہی کی طرح تھی۔ (دیکھیے صفحہ ۱۵۵ - ۱۵۸) ع۱

دکنی زبان کے بہمنی دور کے موضوعات کی عمدہ اور صحیح تقسیم بھی کی گئی ہے کہ ایسے قصے منظوم کیے گئے ہیں جن سے نصیحت حاصل ہو، مذہبی جذبات کو آسودگی ملے اور تصوف و اخلاق کے موضوعات سے روحانی تسکین کا سامان مہیا ہو۔ اسی دور کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے جس میں راجہ کدم راؤ کی زندگی کے حیرت ناک اور دلچسپ واقعات کو نظم کیا گیا ہے ع۲

اسی زمانے کی (۱۰۲۳ھ / ۱۶۱۴ء) ایک تصنیف "بھوگ بل" کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۱۵۶) لکھا ہے کہ "اس کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو "دکنی" کے نام سے پکارا ع۳ - پھر اس زمانے کی لسانی خصوصیات پر مفصل بحث آئی ہے۔

ع۱ صفحہ ۱۵۵ میں آپ نے لکھا بھی ہے کہ "گجری اردو اور اس دور کی زبان و بیان میں کوئی خاص فرق نہیں"۔

ع۲ غالباً ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے کہ کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) کے میرے ایک عزیز شاگرد نعیم الدین صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر، پروفیسر اور پرنسپل بھی ہوئے) مجھے اپنے دولت کدے پر ایلچپور (برار) لے گئے۔ اُن کے یہاں ولی ویلوری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین مثنویاں ملیں اور ایک قدیم تر مثنوی بھی ملی جو کدم راؤ پدم راؤ والی زبان میں تھی اور اُس سے مقدم نہیں تو مؤخر بھی نہیں تھی۔ اس کے شروع کا ایک نام پنچھل واس تو یاد ہے، کچھ اور یاد نہیں۔ افسوس کہ یہ دونوں مخطوطے نعیم الدین صاحب سے ایک صاحب لے گئے پھر اُن کا پتا نہ چل سکا۔

ع۳ نعیم الدین صاحب کے یہاں ولی ویلوری کی جو تین مثنویاں (روضۃ الشہداء، روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ) تھیں، اُن کے حاشیے پر ایک مثنوی پندنامہ بھی درج تھی جو ۱۰۰۰ھ کی تصنیف تھی اور ایک مثنوی اساس المصلیٰ بھی درج تھی جو اشتیاقی شاعر کی تھی اُس کے آخر میں یہ اشعار تھے:—

اساس المصلیٰ ہوا سب تمام — نبیؐ پر درود اں کہو والسلام
کیا اشتیاقی نے دکھنی اسے — سمجھ آئے گر ٹھیک یو پر کسے
ہزار پو چوتھا اتھا سال جب — مرتب ہوا یو رسالہ سو تب

یعنی ۱۰۰۴ھ میں یہ مثنوی اشتیاقی نے مکمل کی تھی اور اس میں اسے "دکھنی" کہا ہے — حاشیے کی یہ دونوں مثنویاں بھی ولی ویلوری کے قلم سے لکھی ہوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان مثنویوں کے مصنف ولی ویلوری کے بزرگوں میں سے رہے ہوں گے — ان سب مثنویوں کے متعلق راقم الحروف کا مضمون رسالہ معارف (اعظم گڑھ - جنوری ۱۹۴۰ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فصلِ سوم کے دوسرے باب میں نظامی سے اشرف تک شعراء کی زبان اور اس کے بیان پر بحث ہے۔ نظامی تو ڈاکٹر صاحب کا خاص موضوع ہے اور ماشاء اللہ اس پر خوب لکھا ہے۔ ابتداء میں معراج العاشقین پر بھی بحث ہے کہ وہ حضرت گیسو دراز کی تصنیف نہیں ہے بلکہ مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری کی ہے جیسا کہ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ثابت کیا ہے۔

فصلِ چہارم میں عادل شاہی دور کے ادب پر خصوصی بحث ہے اور صحیح تجزیہ کیا ہے کہ "گجری ادب[1]، اصل میں ہندوی روایت کی تجدید ہے، بہمنی دور کا ادب اسی روایت کی مزید تجدید و توسیع ہے اور (اسی طرح) بیجاپوری ادب بھی" (صفحہ ۱۸۷)۔ چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ "جب عادل شاہی سلطنت نے آنکھ کھولی تو بیجاپور میں گجری (ہندوی) روایت کے اثرات چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسی روایت نے یہاں کے لکھنے والوں میں گجری کو معیارِ زبان و ادب کے طور پر قبول کرنے کا رجحان پیدا کیا۔ یہی وہ بنیادی رجحان تھا جس نے بیجاپور کی زبان پر گہرا اثر ڈالا۔ اور اسی اثر نے بیجاپور کے رنگِ بیان اور اسلوب کو گولکنڈا کے اسلوب سے الگ کر دیا ---- اگر اردو زبان کا جدید اسلوب، فارسی اسلوب اور آہنگ سے نہ بنتا اور وہ بیجاپوری اسلوب کی روایت سے جنم لیتا تو آج بیجاپور کے شعراء کا کلام، بمقابلہ گولکنڈا کے شعراء کے [illegible] ہمارے لیے زیادہ آسان ہوتا۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے دکنی کا سب سے بڑا شاعر نصرتی، جلد ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔" ایسی بات بہت وسیع مطالعے کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے اور ڈاکٹر صاحب یقیناً داد کے مستحق ہیں۔ اس کے بعد پھر عمدہ لسانی تجزیہ بھی ہے جس سے اس باب کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر دوسرے باب میں گجری ادب اور ہندوی روایت کے عروج پر بحث ہے۔ اس کے بعد سلطان محمد عادل شاہ کے عہد کی ہندوی اور فارسی روایت کی کشمکش کا ذکر ہے کہ فارسی اثرات تیزی سے غالب آ رہے ہیں۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ میرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں[2]۔ پھر میرزا مقیم کی مثنوی "فتح نامہ بکھیری" پر تفصیل سے بحث ہے اور مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" کی عشقیہ مثنوی کی ہندوی اور فارسی روایتوں کا تجزیہ کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ "میرزا مقیم، مقیمی اور عاجز کی مثنویوں کے بعد زبان و بیان کا رُخ مقرر ہو جاتا ہے اور بیجاپوری اسلوب اب شعوری طور پر اسی اسلوب سے وابستہ ہو جاتا ہے" (صفحہ ۲۵۱)۔ چنانچہ ملک خوشنود، صنعتی، رستمی، اور حسن شوقی سب اس اسلوب سے قریب تر ہوتے گئے ہیں۔ اور انھوں نے فارسی کے تتبع کو عام کرنے کی کوشش کی ہے[3]۔ یہی خصوصیت مذہبی تصانیف کی بھی ہے جو فارسی اسلوب سے متاثر ہیں اور ماحول کی

۱۔ ڈاکٹر صاحب کو روایت کے متعین کرنے کا شوق ہے۔

۲۔ اگر میرزا مقیم کی وفات ۱۰۷۵ھ اور ۱۰۸۰ھ کے درمیان ہوئی (مقدمہ چندر بدن و مہیار از اکبر الدین صدیقی صفحہ ۱۹) تو ظاہر ہے کہ وہ اُس مقیمی سے مختلف تھا جس نے ۱۰۹۸ھ میں مثنوی چندر بدن و مہیار لکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی کے دو شعر (صفحہ ۲۳۷) دیئے ہیں:

تتبع غواصی کا باندھیا ہوں میں — سخن مختصر لیا کے ساندیا ہوں میں
عنایت جو اُس کی ہوئی مجھ اُپر — یو تب لغظ قصہ کیا سر بسر

راقم الحروف کے پاس جو نسخہ اس مثنوی کا ہے اُس میں یہ دوسرا شعر نہیں ہے اور اس کے اشعار یہ ہیں:

تتبع غواصی کا باندھیا ہوں میں — سخن مختصر لیک ساندھیا ہوں میں
دلے میں الیس کوں سرایا نہیں — شعر میں کسی کا چرایا نہیں
سرانا چرانا منا کام ہے — کریں تو عمل یو کہ جو خام ہے
شعر کا تلازم گردار ہے — سنوارنا طبیعت کوں ناچار ہے

اس انداز کے قطعے سید محمد والہ (م ۱۱۸۴ھ)، میر تقی میر اور مصحفی وغیرہ نے بھی نظم کیے ہیں۔ دیکھیں راقم الحروف کی کتاب علمی نقوش صفحہ ۱۰۹ ایجوکیشنل

۳۔ صفحہ ۲۹۹ میں "کاتب الحروف شیخ داول" اور "کاتب الحروف فقیر الحقیر فتح محمد ابن شاہ داول" کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ان دونوں باپ بیٹے کا پیشہ کتابت تھا۔ یہ بات مزید غور طلب ہے۔ شیخ داول پر محمد اکبر الدین صدیقی نے بھی قدیم اردو (حیدرآباد دکن ۱۹۶۵ء) میں لکھا ہے۔ اصل میں غواصی کی مثنوی میناستونتی کی تفصیل ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پسند اور ناپسند کا اظہار کرتی ہیں۔ شیخ داول، خوش دہان اور امین الدین اعلیٰ کی تصانیف اپنے مذہبی رنگ کے باوجود ادبیت کا قدیم نمونہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مخطوطات کا فاضلانہ طریقے سے جائزہ لیا ہے[1]، نیز قدیم ریختہ کی نشان دہی بھی کی ہے۔

اس بحث کے بعد "دکنی ادب" کے عروج کی داستان ہے۔ شاہی اور نصرتی پر تفصیل سے بحث ہے۔ لیکن اس دور کے لیے مزید شعراء بھی شامل کیے جا سکیں گے جن کا حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دور پر نصرتی کے اثرات کا ذکر اس طرح (صفحہ ۲۵۳) کیا ہے:

"نصرتی نے اپنے دور کی شاعری پر دو گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلا اثر تو یہ تھا کہ اس نے زبان و بیان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جہاں تک دکنی شاعری اب تک نہیں پہنچی تھی۔ دوسرا اثر یہ تھا کہ اس نے ہیئت اور مواد کے گہرے رشتے کو واضح کیا اور اپنی شاعری میں ایک نئے فنی توازن کو قائم کیا" — یہ بات بالکل صحیح ہے، کیونکہ جو شاعر اس قدر اور اتنے عرصے تک ادب کی خدمت کرتا ہے وہ "عہد آفریں" بن جاتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسے اسالیب مہیا کر جاتا ہے جن پر بہت سے ادبی پاروں کی اساس قائم ہو سکتی ہے۔ دیوانِ ہاشمی میں غزل کو امتیازی شان حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے اسباب و علل اور اس کے رنگ روپ پر عمدہ فاضلانہ بحث کی ہے۔ پھر ایامی کی غزلوں اور مثنوی پر بحث ہے اور مرزا کے مراثی کا جائزہ بھی ہے۔

اس کے بعد فصلِ پنجم میں ڈاکٹر صاحب نے قطب شاہی دور کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے (صفحہ ۳۲۷) کہ: "شمال اور جنوب کے ایک ہو جانے کے بعد "نئے ادب" کی کیا صورت بنی؟ اس کا کیا معیار قائم ہوا؟ ولی کب اور کیسے ظہور میں آیا؟ اس کا اصل کارنامہ کیا ہے؟" — اس ذیل میں قطب شاہی دور کی مختصر تاریخ، پھر گولکنڈہ اور بیجاپور کے ادب کے نمونے، فارسی روایت کا آغاز، اس کا رواج، اس کا عروج، توسیع، تکرار اور آخر میں دکنی روایت کا خاتمہ وغیرہ عنوانات ہیں جن کے تحت مختلف شواہد کے ساتھ دکنی روایت کے اختتام اور فارسی روایت کے آغاز کا ذکر ہے۔ فارسی روایت کے عروج کے سلسلے میں وجہی کا نام سب سے پہلے آیا ہے، کیونکہ اس نے فارسی اسالیب کو نظم و نثر دونوں میں اختیار کیا ہے[2]۔

پھر وجہی کی تصانیف کا ذکر ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ تاج الحقائق، وجہی کی تصنیف نہیں ہے[3]۔ وجہی کی قطب مشتری اور سب رس پر تفصیل سے بحث ہے اور ان دونوں کتابوں کی اہمیت کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور آگے چل کر مجموعی طور پر محمد علی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے درباروں کی ادبی خدمات کا اجمالی ذکر بھی ہے[4]۔

---

[1] صفحہ ۳۰۶ کا یہ جملہ حاشیے میں ہوتا تو بہتر تھا: "۱۱۵۰ھ میں شاہ ولی اللہ قادری نے اس رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا" — صفحہ ۳۰۸ میں ڈاکٹر صاحب نے خوش دہان کے متعلق لکھا ہے کہ "فکری سطح پر وہ جانم کی لکیر کے فقیر ہیں ..." — یہ بات صحیح بھی ہے لیکن ایسا بھی ہے کہ خوش دہان نے "ذکرِ خفی" (صفحہ ۳۰۷-۳۰۸) پر زور دیا ہے اور جانم نے (صفحہ ۲۰۳-۲۰۴) ذکرِ خفی سے زیادہ ذکرِ جلی پر زور دیا ہے۔

[2] ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۳۲۷ کے حاشیے میں وجہی کا ایک فارسی شعر نقل کیا ہے:

اسمم اسد اللہ و وجہیہ است تخلص — آرائش و کانچہ بازار کلام است

غالباً دوسرا مصرع اس طرح ہوگا: — آرائشِ دکانچۂ بازارِ کلام است

[3] ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۳۴۳) لکھا ہے کہ تاج الحقائق کے مصنف کی بات کو "خدا کی بات" کہا گیا ہے۔ لیکن جو عبارت دی گئی ہے اس میں اُن کی بات کو "خدا کی بات میں سند" کہا گیا ہے۔

[4] برہانِ قاطع بھی اسی عہد کی فرہنگ ہے۔ اس کے ہم نام اور ہم عصر محمد حسین تبریزی المتخلص معلوم ہے۔ راقم الحروف کا مضمون اورینٹل کالج میگزین (ستمبر، دسمبر ۱۹۶۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر ڈاکٹر صاحب نے ولی کے نام اور سنین پر بحث کی ہے۔ ولی کے نام کے متعلق تو صرف اس کا یہ شعر کافی ہو سکتا ہے:-

بعدِ شاہِ نجف، ولی اللہ ــــ پیرِ کامل علی رضا پایا عــ۱

یعنی اے ولی اللہ، شاہِ نجف یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد (اُن کے سلسلے میں) مجھے پیرِ کامل شیخ علی رضا عــ۲ (م ۱۱۴۳ھ) ملے ہیں ــــ یہ شیخ علی رضا، شیخ فرخ شاہؒ (م ۱۱۱۸ھ) کے صاحبزادے تھے اور شیخ فرخ شاہؒ حضرت خواجہ محمد سعیدؒ ابن حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے صاحبزادے تھے۔ روضۃ القیومیہ (۱/۲۹۵ بعد) میں شیخ علی رضاؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ علوم سیمیا، کیمیا، ریمیا وغیرہ اور نغمہ و سماع سے بھی (اپنے اسلافِ کرام کے خلاف) تعلق رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں وہ پھر اپنے والد صاحب سے رجوع ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے ولی کے سنین کے لیے فراقی کی مثنوی مرآۃ الحشر کے آخر کے قطعۂ تاریخ کو بنیاد بنایا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ:-

کیا قصدِ تاریخ جب بولنا ــــ یو اجمال، تفصیل کے کھولنا

تو مجھ دل کیا اس و زا انتخاب ــــ یو دیکھو جو ہے بابرکت کتاب (۱۱۳۳ھ) عــ۳

ڈاکٹر صاحب نے آخری مصرع کے تمام الفاظ کے اعداد جوڑ کر ۱۱۳۳ھ بنایا ہے اور پھر (صفحہ ۵۳۷) لکھا ہے کہ "اس مثنوی میں فراقی نے جن مرحوم شعراء کا ذکر کیا ہے اُن میں نصرتی اور حسن شوقی تو شامل ہیں۔ لیکن ولی کا ذکر نہیں" یعنی ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ ولی اس مثنوی کی تحریر کے وقت (۱۱۳۳ھ) زندہ تھے اور جن لوگوں نے اُن کی وفات ۱۱۱۹ھ میں متعین کی ہے وہ صحیح نہیں ہے ــــ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ولی کے مرشد علی رضا کا انتقال ۱۱۴۳ھ میں ہوا۔ شاہ گلشنؒ کا ۱۱۴۰ھ میں اور نور الدین صدیقی سہروردیؒ کا ۱۱۵۵ھ میں ہوا تو ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں قرینِ قیاس نہیں ہے ــــ بہرحال، شواہد کی کم یابی یا نایابی کی وجہ سے ہم نہ تو ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کو آسانی سے رد کر سکتے کہ مذکورہ بالا قطعۂ تاریخ کے آخری مصرع کے تمام الفاظ کو جوڑ کر ۱۱۳۳ھ صحیح سمجھا جائے اور نہ ہم اُس قطعۂ تاریخ کو نظر انداز کر سکتے جو ولی کے قلمی دیوان (جامع مسجد۔ بمبئی) کے آخر میں درج ہے اور جس سے ۱۱۱۹ھ برآمد ہوتا ہے۔ عــ۴

پھر ولی کا دہلی جانا یا نہ جانا بھی متعین کرنا مشکل ہو گا، حالانکہ کئی فضلاء نے لکھا ہے کہ ولی دہلی گئے تھے عــ۵۔

عــ۱ پہلے مصرع کے پہلے لفظ کو بعض حضرات نے "بادشاہ" پڑھا ہے۔ یعنی ع بادشاہِ نجف ولی اللہ ــ لیکن اس طرح پڑھنے سے اس کا ربط دوسرے مصرع سے صحیح نہیں رہتا ــ

عــ۲ مرآۃِ احمدی (صفحہ ۱۲۴) میں ان کی تاریخِ وفات یکم ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ درج ہے ــ

عــ۳ ڈاکٹر صاحب نے انجمن ترقی اردو کے مخطوطے کا حوالہ دیا ہے جو بے شک ناقص الاول اور ناقص الآخر ہے۔ افسر الدین ہاشمی نے اردو مخطوطات (جلد دوم۔ صفحہ ۸۲) میں اس تصنیف کا سال ۱۱۰۰ھ لکھا ہے ــ

عــ۴ مولانا افسر نے (مخطوطات۔ جلد پنجم۔ صفحہ ۲۸۱) میں فراقی کی جو غزل درج کی ہے وہ زبان کے لحاظ سے اس فراقی کی مثنوی کی زبان سے بہت متقدم معلوم ہوتی ہے۔ پھر اگر اس مثنوی کو ۱۱۳۳ھ کی تصنیف سمجھا جائے کہ جس میں شاعر نے لکھا ہے کہ میری ساری عمر فارسی میں صرف ہوئی تو گویا اُس نے اس سال سے پہلے دکنی اردو میں بہت کم (یا بالکل نہیں) لکھا تھا، تو پھر ایسی حالت میں وہ ولی (جس کی وفات ڈاکٹر صاحب نے ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے درمیان متعین کرنے کی کوشش کی ہے) کیونکر اس شاعر کے مصرع پر گرہ لگاتا!

عــ۵ حکیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم (صفحہ ۱۰۴) میں لکھا ہے کہ ولی نے فقیر اللہ آزاد کی غزل پر غزل لکھی تھی اور آزاد، فراقی کے ساتھ دہلی گئے تھے ــ ڈاکٹر زور نے تذکرۂ مخطوطات (چہارم۔ صفحہ ۲۷۲) میں لکھا ہے کہ "فراقی نے آزاد اور ولی کے ساتھ اورنگ آباد سے نکل کر سورت، احمد آباد اور دلی تک کا سفر کیا تھا" ــــ خود ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ولی، دہلی گئے تھے (صفحہ ۵۶۰) ــ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر صاحب نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے کے اُن دوسرے شعراء کا ذکر بھی کیا ہے جن کے بارے میں پہلے پوری طرح تحقیق نہیں تھی مثلاً قطب زاری[1]، قطبی، ابن نشاطی، سید بلاقی[2]، عبداللطیف، بھدوی وغیرہ کے حالات اور تصانیف سے متعلق بہت مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ابن نشاطی کی مثنوی "پھول بن"[3] کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ اس دور میں "عشق" ہی مختلف تصانیف کا موضوع تھا اور اسی روایت نے ولی کی غزل کے لیے گنجائش پیدا کی تاہم یہ ضرور ہے کہ اس دور میں دین اور تصوف بھی ادب پر غالب تھا جو "عشق" ہی کی ایک منزل ہے۔ عبداللطیف، معظم، غواصی وغیرہ کی نظم اور میراں جی خدانما، میراں یعقوب وغیرہ کی نثر بھی اسی سلسلہ روایت کی کڑیاں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے "فارسی روایت کی تکرار" (صفحہ ۵۰۶) کے ذیل میں بہت خوب لکھا ہے کہ "زوال پذیر معاشرے میں فرد صرف اپنی ذات کو مرکز بنا کر زندگی کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔ تنگ نظری، مفاد پرستی، علاقائی تعصبات اور ملک فروشی، حکمراں قوتیں بن جاتی ہیں۔۔۔ یہی صورت حال ابوالحسن تانا شاہ کے دور حکومت میں نظر آتی ہے۔ دیواریں گر رہی ہیں اور تخلیقی قوتیں بجھ گئی ہیں"۔ بے شک اس دور میں وجہی یا غواصی جیسا شاعر نہیں ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۵۰۷) اعتراف کیا ہے کہ "ادب کی طویل روایت اور شمال کے گہرے اثرات کی وجہ سے زبان و بیان میں صفائی و روانی پیدا ہو گئی ہے اور زبان و بیان کے نئے معیار کے خد و خال صاف نظر آ رہے ہیں اور یہ خصوصیت خود ابوالحسن تانا شاہ کے کلام میں بھی ملتی ہے۔۔۔"۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے طبعی کی مثنوی "بہرام و گل اندام" کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "اگر امین و دولت اور ملک خوشنود کی مثنویوں سے طبعی کی مثنوی کا مقابلہ کیا جائے تو زبان و بیان، فن اور ترتیب قصہ کے اعتبار سے یہ زیادہ پختہ معلوم ہوتی ہے"۔ یعنی اس دور میں مثنوی نے بھی ترقی کی ہے، کیونکہ اب فارسی ہی کی تقلید میں لکھی جانے لگی تھی۔ پھر مختار، فتاحی، شغلی، ضعیفی، خواص، سیوک، قدرتی، فائز، اولیا[4] وغیرہ کے کلام کا جائزہ ہے اور دکنی ادب کے خاتمے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں اور حسین ذوقی، قاضی محمود بحری کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ریختہ کی روایت کی مقبولیت کا آغاز متعین کیا ہے۔

فصل ششم میں "فارسی روایت کا نیا عروج" مذکور ہے جس میں ولی پیش پیش ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ "ولی کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے شمال کی زبان کو دکنی ادب کی طویل روایت سے ملا کر ایک کر دیا اور ساتھ ساتھ فارسی ادب کی رچاوٹ سے اس میں ایسی رنگا رنگ آوازیں شامل کر دیں اور امکانات کی ایسی نئی سمت بھی ابھار دی کہ آئندہ دو سو سال تک اردو شاعری انہی امکانات کے ستاروں سے روشنی حاصل کرتی رہی" (صفحہ ۵۲۹)

۱۔ صفحہ ۴۸۶ میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ زاری نہیں، زاری صحیح ہے لیکن کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ قطبی دوسرا شاعر ہے جو بے شک ہوگا۔ لیکن اس قطب کو حکیم شمس الدین قادری نے اردوئے قدیم (صفحہ ۶۸) میں اس شعر کی بنا پر قطبی بھی کہا ہے:

نازش جہاں میں مری کیا، کیا ہنر الا کے جو بھی — قطبی دھریا اُمید ہو، لایا ہوں سب صاحب نظر

۲۔ سید بلاقی کے معراج نامہ پر عزیزی پروفیسر نصیرالدین نے بھی ناگپور یونیورسٹی جرنل میں بحث کی تھی۔ مجھے اب اس کی تاریخ یاد نہیں رہی۔ اس شاعر پر راقم الحروف نے بھی ناگپور یونیورسٹی جرنل (نمبر ۔ ۱۹۶۳ء) میں لکھا تھا۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ پھول بن ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی ہوگی۔ حکیم شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب (صفحہ ۶۹) میں انڈیا آفس والے نسخہ کا ۱۰۶۶ھ ہی لکھا ہے اور کتب خانہ آصفیہ والے نسخہ کا ۱۰۷۶ھ بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ موخرالذکر نسخہ نظر ثانی کے بعد تیار ہوا ہو۔

۴۔ اولیا کی مثنوی میں "قصہ ابوشحمہ" بیان کیا گیا ہے۔ یہ قصہ جس قدر مشہور کیا گیا ہے اسی قدر تحقیق سے دور ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر ڈاکٹر صاحب نے ولی کے معاصرین اور متاقبین کا جائزہ لیا ہے۔ سراج، فراقی[۲]، داؤد، اور قاسم کی شاعری پر بحث ہے اور اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "لیکن اب جمیل جالبی، آخر کس کس کا ذکر کروگے؟" (صفحہ ۵۸۵)۔ پھر "اختتامیہ" میں بولی، زبان اور ادب کی مختلف منزلوں کی شناخت کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ولی نے اردو زبان و ادب کے ارتقاء کو جدید دائرے میں داخل کر دیا اور فارسی روایت کو ایک نیا عروج دے کر اسے اردو زبان و ادب کا مقدر بنا دیا۔۔۔" (صفحہ ۵۹۰) گویا اس جلد کا اختتامیہ ولی کی خدمات پر مہر ثبت کرتا ہے اور اس کے بعد پاکستان کے مختلف علاقوں کی اردو خدمات پر ضمیمے شامل کیے گئے ہیں۔

"پنجاب میں اردو" والا ضمیمہ سب سے پہلے ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیے، کیونکہ "اردو شاعری کی روایت کے مطالعے سے، جو ناتھ پنتھیوں کے کلام اور پھر چھٹی صدی ہجری سے آج تک مسلسل سرزمینِ پنجاب پر جاری و ساری ہے، یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ زبان، جسے مسلمانوں نے یہیں سے اٹھایا، سینے سے لگایا اور اپنی فتوحات کے ساتھ سارے برِ عظیم میں پھیلا دیا، ایک ایسی زبان تھی جو یہاں مختلف علاقائی زبانوں کے درمیان ایک بین العلاقائی زبان کی حیثیت سے شروع ہی سے موجود اور رائج تھی۔ اسی لیے آج تک پنجابی اور اردو ایک ہی زبان کے دو روپ نظر آتے ہیں" (صفحہ ۶۶۹)۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حصے میں مسعود سعد سلمان، بابا فرید شکر گنج[۲]، گرو نانک، شاہ حسین، مولانا عبدی، حاجی محمد نوشہ، شیخ عثمان جالندھری[۱]، افضل جھنجھانوی، ناصر علی، شاہ مراد[۲]، جعفر زٹلی، فاضل الدین بٹالوی، بلھے شاہ، وارث شاہ، مراد شاہ وغیرہ کے کلام کا دوسرے علاقوں کے کلام سے تقابلی مطالعہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ "وہ سامراجی قوتیں جو پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازشیں کر رہی ہیں اور اسی لیے مختلف الزبان آبادیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش میں ہیں، اُن کا بنیادی منصوبہ یہی ہے کہ اسلام اور اردو کو، جو آج تک جوڑنے اور متحد رکھنے کا کام کر رہے ہیں، کھرچ کر کمزور اور بے اثر کر دیا جائے" (صفحہ ۶۷۹)۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "سندھ میں اردو" والا ضمیمہ شامل کیا ہے۔ اور اس ضمیمے میں بھی ڈاکٹر صاحب نے سندھ کے مختلف شعراء اور ادباء کے کلام سے اردو کلام کا مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ اردو کیونکر مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور آخر میں علامہ آئی آئی قاضی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اردو بین الاقوامیت، بین الاقوامی قومیت کی علامت ہے۔ یہ زبان دنیا کی تین عظیم تہذیبوں یعنی ہند آریائی، سامی اور منگول تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہ زبان سارے ایشیا کی لنگوا فرینکا بننے کے لیے موزوں ہے"۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبانوں کے "لسانی اشتراک" پر عمدہ بحث کی ہے۔ آخر میں "بلوچستان کی اردو روایت" کا جائزہ لیا ہے اور بلوچستان کے بہت سے الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اردو میں جذب ہو گئے ہیں اور اس طرح یہ ۷۱۲ صفحات کی پہلی جلد ختم ہوتی ہے۔

۱۔ شیخ عثمان جالندھری کئی بزرگوں سے بیعت ہوئے، پھر حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے شیخ سے بیعت ہوئے۔ ان کے مکتوبات اللہ والے کی قومی دکان، لاہور سے شائع ہوئے تھے۔ ان کے متعلق راقم الحروف کا مضمون رسالہ الرحیم (حیدرآباد، نومبر ۱۹۶۷ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت خواجہ محمد معصومؒ ابن حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی اردو کے کئی الفاظ اپنے فارسی مکتوبات میں استعمال کیے ہیں۔

۲۔ ولی کے ایک دوست بھی محمد مراد بیگ تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "مقصودِ دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے
جو مجھ زباں کا وِرد محمد مراد ہے"

شیخ محمد مراد غالباً خواجہ عبد الاحد وحدتؒ (م ۱۱۲۶ھ) المعروف "شاہ گل" کے مکتوبات کے جامع تھے۔ دیکھیں گلشنِ وحدت (مرتبہ راقم الحروف و مولانا عبد اللہ جان۔ کراچی ۱۹۶۶ء) جس میں گل، گلشن اور عندلیب وغیرہ کا ذکر بھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخ ادب اردو کی دوسری جلد اٹھارھویں[1] صدی کے سیاسی پس منظر، پیش منظر، طرزِ فکر اور تہذیبی و معاشرتی حالات کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے بعد ملک میں ابتری پھیل گئی اور "ناخوب" کو "خوب" سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ "پچاس سال کے عرصہ میں نااہل جانشینوں کی بے طاقتی، خانہ جنگی، عیش پرست امراء کی باہمی آمیزش، عسکری قوت کی کمزوری اور سلطنت کے وسیع تر مفاد میں اتحاد کے جذبے کے فقدان نے اس وسیع و عریض سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا (صفحہ ۱)۔ ان حالات کے لیے ڈاکٹر صاحب نے تمام ضروری تاریخیں اور تذکرے کھنگال ڈالے ہیں اور بہت سی معاشی اور معاشرتی خامیوں کی نشان دہی کی ہے[2] اور آخر میں لکھا ہے کہ "اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان، نہ صرف فارسی کی جگہ لے لیتی ہے، بلکہ ادبی زبان بن کر برِ عظیم[3] کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔ اردو زبان کی فتح دراصل برِ عظیم کے عوام کی فتح تھی جس میں ہر مذہب و عقیدہ کے لوگ شریک تھے" (صفحہ ۱۶)۔ لیکن فارسی زبان و ادب کی روایات اور مختلف اثرات برابر قائم رہے اور اب تک ہیں اور یہی چیزیں اردو ادب کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوئی ہیں۔ عروض، اضافتِ سخن، مصطلحات، صنائع و بدائع، اخلاص و اخلاق کے مضامین، شاعرانہ مزاج و مذاق، حسن و عشق کے تصورات اور اُن کے اظہار کے لیے بنیادی الفاظ، محاورات، تلمیحات، خیالات اور بکثرت تراکیب بھی اردو میں فارسی سے اور فارسی کے ذریعے عربی سے بھی ماخوذ ہیں۔

تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فصلِ اول شروع کی ہے اور سترھویں صدی کے دکنی ادب کا پس منظر بیان کیا ہے کہ فتحِ بیجاپور (۱۰۹۷ھ) اور فتحِ گولکنڈہ (۱۰۹۸ھ) کے بعد دکن اور شمال کے تہذیبی اور لسانی تعلقات قریب تر ہوئے، بہت سے شعراء ایسے ہیں کہ ان کی زبان میں زیادہ فرق باقی نہیں رہا۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد یہ اکائی ٹوٹ گئی۔ "جب یہ صورتِ حال ہوتی ہے تو نثر سے طویل جملے اور شاعری سے طویل نظمیں غائب ہونے لگتی ہیں" (صفحہ ۴۴)۔ لیکن پھر اسی صفحے پر ڈاکٹر صاحب نے سیاسی انتشار اور معاشرتی بدحالی کے نتیجے میں بھی طویل نظموں کی تخلیق کا ذکر کیا ہے۔ میلاد نامے، معراج نامے، پند نامے، شہادت نامے، وفات نامے اور جنگ نامے "رسمی مذہبی جذبات کو آسودہ کرنے کے لیے لکھے جانے لگے۔ بلکہ "اس پُر آشوب دور کا ہر فرد تلاشِ سکون میں ایک طرف تصوف[4] کی چھتری کے نیچے آ کھڑا ہوا اور دوسری طرف مذہبی رسوم کی ادائگی کو اپنی خواہشات کے پورا ہونے کا وسیلہ سمجھنے لگا" (صفحہ ۴۴)۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب بہت سے رسم و رواج پہلے ہی (صفحہ ۱۰ تا ۱۵) بیان کر چکے ہیں اور کچھ یہاں بھی بیان کرتے ہیں اور مذہبی رسوم و عقائد سے متعلق مختلف نظموں اور مرثیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ روشن علی روشن سارنگ پوری[5] کی مثنوی عاشور نامہ اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں عوام کی زبان، عوام کے لب و لہجہ میں ہے، گو کہ اس میں فارسی فعل و حرف بھی ہیں۔

---

[1] گیارہ سے اٹھارہ تک "ہ" چاہیے۔ اس لیے "اٹھارویں" کے بجائے "اٹھارھویں" بہتر ہوگا۔

[2] اس دور کے اور سادات بارہہ سے متعلق ایک ضروری ماخذ روضۃ القیومیہ ہے جس میں معاصرانہ واقعات ملتے ہیں۔

[3] یہاں اور ہر جگہ ڈاکٹر صاحب نے برِ عظیم (برِ صغیر کو) لکھا ہے۔

[4] پُر آشوب زمانے میں اردو کو فروغ ہوا، بادشاہوں نے اسے منہ لگایا، فارسی تراکیب و محاورات اردو میں منتقل ہونے۔ یہ سب تفصیل تمہید کے دوسرے باب میں ہے۔ لیکن صحیح تصوف وہ نہیں ہے جو عوام اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ صرف "تزکیۂ نفس" ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا لازمی جزو ہے۔ دیکھیں سورۃ البقرہ (۱۵۱)، آلِ عمران (۱۶۴)، الجمعہ (۲) وغیرہ۔

[5] حضرت مجدد الف ثانیؒ (م ۱۰۳۴ھ) کے زمانے میں سارنگ پور، صوفیہ کا مرکز تھا۔ مولانا باقر اور مولانا عبد الباقی وہیں تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح روشن علی روشن اور اسمٰعیل امروہوی کی مثنویوں پر مفصل بحث کرکے ڈاکٹر صاحب نے دکنی اردو اور شمالی اردو کا فرق متعین کیا ہے (صفحہ ۶۶-۶۷) ــ دوسرے باب میں جنگ نامۂ عالم علی خان اور وقائع نامہ (رزم ناموں) کی تفصیل ہے اور اُن کی تاریخی اہمیت بھی بتائی ہے۔ تیسرا باب جعفر زٹلی سے متعلق ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے محمود شیرانی مرحوم کا سے دو جگہ اختلاف کیا ہے : ایک تو یہ کہ جعفر "میر" نہیں تھے، "میرزا" تھے (صفحہ ۹۱) ــ دوسرے یہ کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی اور جعفر کی ولادت ایک ہی سال میں نہیں ہوئی (صفحہ ۹۲) ـ پہلی بات کے متعلق فرمایا ہے کہ کلیات میں ایک نظم "تعداد میرزا جعفر" (صفحہ ۹۱) ہے۔ (گو کہ کوئی شعر نہیں دیا کہ جس میں لفظ میرزا ہو) اور دوسری بات کے متعلق فرمایا ہے کہ جعفر نے میاں دانشمند کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر اُس کی ایک ہجو لکھی تھی اور اُسے تو شاہ جہان کے دربار میں ۱۰۶۵ھ میں ایک قصیدہ پیش کرنے پر انعام بھی ملا تھا (صفحہ ۹۲)۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی (سنہ ۱۰۶۸ھ) کے سال میں جعفر کی ولادت کس طرح متعین ہو سکتی ہے !ـ

پھر ڈاکٹر محی الدین زور کی تحقیق کی بھی تصحیح کی ہے کہ جعفر کا انتقال سنہ ۱۱۰۶ھ میں نہیں بلکہ سنہ ۱۱۲۵ھ میں ہوا ہے، (صفحہ ۹۴)۔ کیونکہ اُس نے سنہ ۱۱۱۳ھ میں سنہ ۱۱۱۸ھ میں تاریخی قطعات لکھے تھے اور بہادر شاہ (سنہ ۱۱۱۸ھ تا ۱۱۲۴ھ) کی بادشاہی کے زمانے کی کیفیت بھی لکھی ہے (صفحہ ۹۳)۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "جعفر کا دور پُر آشوب تھا۔ ایک بڑی تہذیب سنبھالا لے رہی تھی۔ جعفر زٹلی، طنز و ہجو کے ذریعہ اُس کی مسخ روح کو آئینہ دکھاتا ہے اور دوسری طرف ایہام گو شعراء اسی جشن فنا میں شریک ہو کر اس کی ترجمانی کرتے ہیں ــ زٹل اور ایہام گوئی ہی اس دور کے ترجمان بن سکتے تھے اور یہی ہوا" (صفحہ ۱۱۶) ع۲

فصل دوم میں ڈاکٹر صاحب نے فارسی کے ریختہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے اور بہت حسین "تمہید" کے ساتھ کیا ہے کہ :

"موسم بدلتا ہے تو بہت پہلے سے جانے والے موسم اور آنے والے موسم میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ یہ آنکھ مچولی اتنی آہستہ رو ہوتی ہے کہ نئے موسم کی خبر ہمیں اُس وقت ہوتی ہے جب وہ واقعی آچکتا ہے۔ یہی صورت روایت کے ساتھ ہے جو موسم کی طرح وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے اور معاشرے کو اس تبدیلی کی خبر اُس وقت ہوتی ہے جب وہ اُسے قبول کر چکتا ہے" (صفحہ ۱۲۱) ــ روایت کی تبدیلی کو قبول کرنے والے یا معاشرے کو اس تبدیلی کی خبر کرانے والے شعراء میں عبد الغنی قبول، شاہ وحدت (شاہ گل)، شاہ گلشن، بیدل، امید، انجام، پیام،

ع۱ ڈاکٹر صاحب نے بھی دو جگہ صفحہ ۱۱۲ (سطر ۱۶) اور صفحہ ۱۱۵ (آخری سطر) میں میر جعفر ہی لکھا ہے۔

ع۲ جعفر زٹلی کی ایک مستقل تصنیف "جنگ نامہ" کی نشان دہی ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے اپنے مضمون "تین نثری نوادر" (نقوش ــ لاہور سنہ ۱۹۶۶ء) میں کی ہے۔

ع۳ راقم الحروف نے جشن نامہ (اورینٹل کالج ــ لاہور سنہ ۱۹۷۲ء) کے لیے ایک مضمون "کلام بیدل کی تاریخی تعیین" عرض کیا تھا ــ اس میں تفصیل ہے کہ بیدل نے سنہ ۱۰۷۵ھ میں بہار سے دہلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں ۲۶ رجب سنہ ۱۰۷۶ھ کو شاہ جہان کے انتقال پر تاریخ لکھی ــ پھر بہت سے واقعات پر تاریخیں کہیں ــ فرخ سیر (م سنہ ۱۱۳۱ھ) شاہ گل سے بیعت ہو گیا تھا ــ بیدل نے فرخ سیر کی مدح بھی لکھی ہے۔ سفینۂ خوشگو کے دفتر ثالث میں شاہ گل کے فارسی کلام (غزل و رباعی) کے نمونے محفوظ ہیں اور شاہ گلشن سنہ ... کے بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آرزو، مخلص، بہار، آزاد بلگرامی وغیرہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان میں سے کئی شعراء کے حالات بھی دیے ہیں اور کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ شیخ سعد اللہ گلشن کے حالات تحقیق سے لکھے ہیں کہ وہ شاہ گل[1] کے مرید اور بیدل کے شاگرد تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے ولی کو وہ غزل بھی دی تھی (دیوان ولی۔ صفحہ ۱۳۸۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو) جو نمونے کے لیے تھی اور یہ کہ انھوں نے اپنے مرشد کے نام کی مناسبت سے گلشن تخلص اختیار کیا تھا[1] (صفحہ ۱۲۸) پھر یہ بھی لکھا ہے کہ بقول بندرابن داس خوشگو کے، "۲۲ سال احمد آباد، گجرات، اورنگ آباد اور دوسرے بلادِ دکن میں گھومتے۔ اس کے بعد بیس سال دہلی میں رہے" (صفحہ ۱۳۰)۔ خوشگو، شاہ گلشن کے شاگرد تھے اور انھوں نے ۱۱۴۰ھ اُن کا سالِ وفات لکھا ہے۔ یعنی ۱۱۲۰ھ سے ۱۱۴۰ھ تک دہلی میں رہ کر وہیں فوت ہوئے اور اس سے پہلے وہ ۲۲ سال باہر رہے اور ۲۲ سال سے پہلے بھی وہ دہلی ہی میں تھے اور بقول سرخوش کے، "۸-۷ سال اُن کی (سرخوش کی) شاگردی میں رہے تھے۔ اور "آخر میں میرزا بیدل کی صحبت اختیار کی"۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے پیام[2] اکبرآبادی، قزلباش خان امید اور امیر خان انجام کے حالات کی تحقیق کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انجام "ریختی" کے موجد تھے گو کہ اُن کے اس صنف کے اشعار اب دستیاب نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس فصل کے باب دوم میں فارسی کے ریختہ گو شعراء یعنی سراج الدین علی خان آرزو[3]، آنند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار، نواب درگاہ قلی خان درگاہ اور میر غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات اور کلام کا ذکر کیا ہے بعد تفصیل و تحقیق کے ساتھ ان پر بحث کی ہے۔ (آرزو کے سلسلے میں) ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "سراج الدین علی خان آرزو نے اردو میں تقریباً ۲۷ شعر کہے ہیں۔ اشعار کی یہ تعداد ہرگز ایسی نہیں کہ اُن کے حوالے سے اُن کو تاریخ ادب میں کوئی جگہ دی جائے۔ لیکن اس دور کی ایک پُراثر علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے انھوں نے ایسے گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ ریختہ نے فارسی کی جگہ لے لی ہے ... (صفحہ ۱۴۸)۔ لیکن راقم الحروف اتنا اضافہ ضرور کرے گا کہ فنِ لُغت پر جس انداز سے انھوں نے علمی خدمات انجام دی ہیں انھیں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے خود بھی صفحات ۱۰ ۱ تا ۱۶۰ میں اس کا اعتراف کیا ہے اور قدرت اللہ قاسم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اُن کا رتبۂ والا، ریختہ سے بالاتر ہے ..." (صفحہ ۱۶۰)۔

---

[1] تذکرہ نشترِ عشق میں ہے کہ بیدل کی تجویز پر شاہ گلشن نے اپنا تخلص (گلشن) اختیار کیا تھا۔ شاہ گل کے مکتوبات "گلشنِ وحدت" کے نام میں بھی یہی مناسبت نظر آتی ہے۔ ان مکتوبات کے جامع شیخ محمد مراد کشمیری تھے اور ممکن ہے کہ ولی نے انھی کے متعلق کہا ہو:۔ مقصودِ دل ہے اُس کا خیال اے ولی مجھے جو جگ زباں کا ورد محمد مراد ہے

ولی کے ایک شعر میں (عمداً نہ سہی) وحدت اور گل کی رعایت بھی ہے:

وحدت کے گلستاں کا چمن چشن ہو تیرا — پھولا ہے نین بیچ بہارِ گل و نرگس

بہرحال، شاعری کا سلسلہ اس طرح بن جاتا ہے کہ شاہ گل کے شاگرد شاہ گلشن اور شاہ گلشن کے شاگرد عندلیب (اور ولی بھی) اور اُن کے صاحبزادے خواجہ میر درد اور میر اثر۔

[2] پیام کا نام شرف الدین علی خان تھا۔ تذکرۂ خوشگو معرکۂ زیبا (لاہور ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۳۱م) میں بھی اسی نام اور تخلص کا ایک شاعر مذکور ہے جو مصحفی کا شاگرد تھا۔ تذکرہ میں یہ شعر بھی دیا ہے:

ہائے اس دیوانے دل نے کام ہی ایسا کیا — آپ تو بدنام تھا اور مجھ کو بھی رسوا کیا

[3] سراج الدین علی خان آرزو کی چراغِ ہدایت، غیاث اللغات کے حاشیے پر بھی نول کشور نے ۱۸۸۰ء میں شائع کی تھی اور خود صاحبِ غیاث اللغات نے اس سے استفادہ کرنے کا اعتراف مقدمے میں کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس دور میں فارسی شاعری کی علامات اور اشارات کا استعمال اردو میں عام ہو گیا تھا اور درگاہ قلی خان کی "مرقع دہلی" سے نہ صرف محمد شاہی دور کی معاشرتی حالت کی تفصیل معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اس دور میں ریختہ کا رواج عام ہو گیا تھا۔ منقبت کہنے میں جاوید خان، مرثیہ گوئی میں مسکین، حزین اور غمگین شہرت رکھتے تھے، محمد نعیم، ریختہ میں ایسی شاعری کرتا تھا کہ جیسے فارسیاں، فارسی نظم کرتے تھے۔ محفلوں میں فارسی اور ریختہ کے اشعار ساتھ ساتھ پڑھے جاتے تھے" (صفحہ ۱۷۱)۔ تاہم یہ دور فارسی اور عربی ہی کا تھا اور عربی میں حسان الہند آزاد بلگرامی تو برصغیر کے سب سے زیادہ مستند علماء میں شمار ہوتے تھے۔

فصل سوم، ولی کے اثرات سے شروع ہوتی ہے اور ایہام گوئی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی توجیہ ڈاکٹر صاحب نے اس طرح کی ہے کہ "(اس دور میں) ہر شخص ۔۔۔ اپنے کھوکھلے پن کو چھپانے کے لیے ظاہری نمائش پر زور دے رہا تھا۔ اس کا ظاہر اس کے باطن سے مختلف تھا۔ ثنویت کا تضاد، فرد کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ (اس طرح) سارے معاشرے کو ہر چیز اور ہر بات کے دو رُخ اور دو معنی نظر آ رہے تھے" (صفحہ ۱۹۰)۔ ایہام گوئی کو داغ دار بنانے کے کچھ اور عوامل بھی تھے (صفحہ ۱۹۶ اور ۲۰۱)۔ ڈاکٹر صاحب نے فارسی شعراء کی روایات کی (صفحہ ۱۹۶) اور صوفیہ کے "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" (صفحہ ۲۰۱) کی جس طرح توجیہ کی ہے اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اتنی حقیقت ضرور ہے کہ معاشرے سے اذہان بدلتے ہیں اور چھوٹے بڑے سب کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اور گو کہ ایسے دور میں "کوئی چراغ دہلی، کوئی گیسو دراز یا کوئی نظام الدین اولیاء نظر نہیں آتا" (صفحہ ۲۰۱)۔ تاہم یہی دور اصلاح حال کا ضرور ہے، کیونکہ اسی دور میں پہلے درپے شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ)، ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ (م ۱۱۷۶ھ)، حضرت مظہر جانِ جاناں (م ۱۱۹۵ھ) اور شاہ فخر دہلوی (م ۱۱۹۹ھ) جیسے علماء اور صوفیہ دہلی ہی میں پیدا ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر شمالی ہند کے صاحبِ دیوان شعراء کی اولیت پر بحث کی ہے اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے اس قول کو صحیح نہیں سمجھا کہ فائز ایسے شاعروں میں سب سے مقدم ہیں (صفحہ ۲۰۳)۔ ڈاکٹر صاحب نے ثابت کیا ہے کہ "شمالی ہند کے ریختہ گو شعراء میں آبرو پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولی کے انداز پر (فائز کی طرح) اپنا دیوانِ ریختہ مرتب کیا" (صفحہ ۲۰۷)۔ اسی لیے اس فصل کے دوسرے باب میں آبرو ہی کی شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے شروع میں ان کے حالات کی تحقیق کی ہے، پھر سعادت خان ناصر کے حوالے سے آبرو اور حضرت مظہر کے مکابرہ کا ذکر کیا ہے کہ حضرت مظہر نے ان کی مذمت میں ایک شعر کہا تھا۔ یہ واقعہ اور ایسے دوسرے واقعات جو محمد حسین آزاد نے بھی مختلف پاکیزہ نفوس کے متعلق تراشے ہیں تاریخ کی روشنی میں غلط معلوم ہوتے ہیں۔ آبرو ۱۰۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴۶ھ میں فوت ہوئے۔ دہلی میں ان کی آمد کی تاریخ اور وہاں کے قیام کی صحیح مدت متعین نہیں۔ فرض کر لیا جائے کہ وہ ۲۵-۳۰ سال کی عمر میں دہلی آ گئے تھے یعنی (۱۱۲۰ھ یا ۱۱۲۵ھ) تو اس وقت حضرت مظہر کی عمر ۱۰-۱۵ سال کی ہوگی۔ حضرت مظہرؒ نے اپنے فارسی دیوان کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "در سالِ شانزدہ از عمر بر روے ایں خاکسار غبارِ یتیمی نشست و در بیست، مشتِ خاکِ خود را بداماںِ درویشاں لبست، مدتِ سی سال بر درِ مدرسہ و خانقاہ جاروب کشید و ایام گزیدہ عمر درین شغل شریف گزرانید بحول اللہ و قوتہ در طولِ مدتِ زندگی، دستِ طلب بلوثِ دنیا نیالود و پا بے سعی درین راہ نفرسود۔ امروز کہ ہزار و صد و ہشتاد ہجری است و عمر بشصت رسیدہ از بیست سال بکنجِ عزلت آرمیدہ است ۔۔۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی بیس سال کی عمر سے قریب تیس سال تک آپ نے "مدرسہ و خانقاہ" میں اپنی عمر گزاری، اور قریب ۱۱۵۰ھ سے گوشہ نشینی اختیار کی — ڈاکٹر صاحب نے بھی صفحہ ۳۶۱ تا ۳۶۴ ان کے فضائل و خواص کا ذکر کیا ہے — تو پھر ان جیسے پاکیزہ نفس بزرگ کے لیے آبرو کی زبان کے لیے ویسا شعر ادا ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ ع۱

ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ " ایہام گوئی ع۲ چونکہ نئے رویوں اور ذہنی تبدیلیوں کا ساتھ دینے سے قاصر تھی، اس لیے بیس سال کے اندر اندر اس کا اثر زائل ہو گیا اور اس کی جگہ نئی شاعری نے لے لی۔ اس نئے رجحان کے پہلے ترجمان مرزا مظہر جانِ جاناں تھے جو ایک طرف فارسی و اردو کے شاعر تھے اور دوسری طرف روحانی سطح پر اس دور میں رشد و ہدایت کا مرکز تھے " (صفحہ ۳۴۸) — اسی کے ساتھ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب " فارسی شاعری کے سارے اسالیب، اصناف اور ہیئت، اردو شاعری کے لیے قابلِ قبول ہو گئے اور ایک پختہ کار زبان کی شاعری اور اس کے تمام موضوعات — تصوف، وارداتِ عشق، اخلاقیات، خمریات، رندی و درویشی، حیات و کائنات کے مسائل بھی اس کے تصرف میں آ گئے — فارسی آہنگ و لہجہ، اس کی لحن و لے، استعارات و تشبیہات کا رنگ و مزاج، رمزیات و ضمنیات، علامات و تلمیحات، بندشیں و تراکیب، اردو شاعری کے خون میں شامل ہو گئے " (صفحہ ۳۵۱) — پھر آپ نے "ردِ عمل" والے شعراء کی زبان و بیان کا پس منظر بیان کر کے ایسے شعراء کی خدمات کا اعتراف کیا ہے — اور اس فصل کے دوسرے باب میں حضرت مظہر اور ان کے شاگردوں کی لسانی اور ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے — اور بتایا ہے کہ غیر ایہام ع۳ والے شعراء سے ان کا درجہ کس قدر بلند ہے — اور انھوں نے کس طرح ایک ایسے کلچر کی تعمیر کی ہے جس میں عرب، ایرانی اور ہندی کلچر مل کر ایک وحدت بن گئے ہیں (صفحہ ۳۵۵) حضرت مظہر کے شاگردوں میں یقین پہلے "جوان" شاعر ہیں جنھوں نے ایہام گویوں سے ہٹ کر صاف اور پاکیزہ ریختہ کہا اور دوسروں نے ان کی پیروی کی (صفحہ ۳۷۲) — یقین حضرت شاہ گل (احمد ... وحدت سرہندی مجددی) کے پوتے تھے، اسی لیے حضرت مظہر کو بہت عزیز تھے اور ان کے فن کے کمال کے متعلق اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ شاہ حاتم جیسے استاد نے ان کی زمین میں غزلیں لکھی تھیں، (پہلی غزل ۱۱۵۲ھ میں ناتمام تھی) —
یقین کے تخلص کے دیوان میں ان کے ابجدی اعداد کے مطابق ۱۷۰ غزلیں ہیں اور ان میں صرف تیرہ بحریں استعمال ہوئی ہیں

ع۱ کلیاتِ طیبات (طبع مراد آباد ۱۸۹۴ء) کے صفحات ۱۶۶ - ۱۶۷ میں بھی شاہ ولی اللہؒ نے بہت احترام اور دعاؤں کے ساتھ حضرت مظہرؒ کو یاد کیا ہے — ڈاکٹر صاحب نے (۳۵۹) حضرت مرزا مظہرؒ کے نام و تخلص کے متعلق مولانا آزاد بلگرامی کا بیان نقل کیا ہے بھگوان داس ہندی نے سفینۂ ہندی (۱۲۱۹ھ) میں اسی سے ملتا جلتا واقعہ دوسری طرح نقل کیا ہے — اور حضرت مظہر کے بعض شاگردوں کا ذکر بھی کیا ہے یعنی، حسین بیگ اظہر (صفحہ ۱۹)، محمد فقیہ دردمند (صفحہ ۷۷)، سنگم لعل عزت (صفحہ ۱۳۸)، شیخ غلام علی ... (صفحہ ۲۱۱) راقم الحروف کی کتاب "لوائح خانقاہ مظہریہ" بھی ملاحظہ ہو —

ع۲ ڈاکٹر صاحب نے ایہام گو شعراء کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے — آبرو کے علاوہ ناجی، مضمون، یک رنگ، احسن، اشتیاق، سعادت علی امروہوی، مکین رند، سجاد وغیرہ پر بھی بحث ہے اور ان کے حالات کا تحقیقی جائزہ بھی لیا ہے — یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے عرصہ ہوا دیوانِ سجاد مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

ع۳ ایسے شعراء کا ذکر فصل سوم کے چوتھے باب میں ہے — اشرف، فائز، رضی، مبتلا، مرغوب، صابر، عزلت کا ذکر بڑی تحقیق کے ساتھ ہے اور ان کے متعلق بہت سی نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں —

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر صاحب نے ان غزلوں کا تجزیہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "یقین نے اپنے مختصر دیوان میں فارسی شاعری کے بنیادی علائم و رموز، تلمیحات و اشارات، بندش و تراکیب، بحور و اوزان اور خوبصورت زمینیں استعمال کرکے اردو شاعری کا رشتہ ایک بار پھر براہِ راست فارسی شاعری کی روایت سے قائم کر دیا۔۔۔" (صفحہ ۴۲۸)۔ عبد الحی تاباں، میر محمد باقر حزیں، محمد فقیہ دردمند، اشرف علی فغاں، احسن الدین بیان، سب اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اور "ردِ عمل تحریک" کے ایک بہت اہم شاعر شاہ حاتم ہیں جنھوں نے اپنی طویل زندگی میں تین دَور دیکھے اور اردو شاعری کو اپنی صلاحیتوں سے ایک ایسی صورت عطا کی جسے نئی نسل کے شعراء نے خود حاتم کی زندگی میں نئے رنگ بھر کر مکمل کر دیا" (صفحہ ۴۵۱)۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب نے اسی فصل کا تیسرا باب شاہ حاتم ہی سے متعلق باندھا ہے۔ اُن کے حالات، اُن کے کلام کی تعیین، نظم و نثر میں اُن کی انفرادیت اور اُن کی مجموعی خدمات کو تفصیل اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔

فصل پنجم کا پہلا باب میر و سودا سے شروع ہوتا ہے اور یہ زمانہ وہ ہے جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہر طرح کی تباہی اور بربادی کی یادگار ہے۔ لیکن یہی زمانہ وہ ہے جب کہ اردو شاعری میں "جذبات و واردات" کا رجحان تیز ہوا (صفحہ ۴۷۰) اور بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، ہجو، مرثیہ، شہر آشوب، واسوخت وغیرہ اصنافِ سخن رواج پذیر ہوئے اور "فارسی کے مسندِ اقتدار سے ہٹتے ہی اردو شاعروں کو بھی وہی مقام مل گیا اور دربار سرکار، امراء و نوابین کی ویسی ہی سرپرستی حاصل ہو گئی جیسی اب تک صرف فارسی گویوں کو حاصل تھی" (صفحہ ۴۹۱)۔ اصنافِ سخن کے علاوہ شعراء کے تذکرے بھی اسی دور میں بہت زیادہ لکھے گئے اور خود زبان و بیان میں تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں۔

فصل پنجم کے دوسرے باب میں میر تقی میر کا حال تفصیل سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ میر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے (۱۱۳۷ھ میں نہیں)، یہ بھی لکھا ہے کہ میر نے خان آرزو سے کسبِ فیض کیا، اُنھی کے مشورے پر ریختہ گوئی شروع کی، بیماری (جنون) کے دوران شاعری کا آغاز ہوا اور بیماری کے بعد تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۱۲۵ھ سے ۱۱۶۰ھ تک وہ آرزو کے پاس رہے، پھر رعایت خاں کے متوسل ہو گئے (صفحہ ۵۰۹)۔ اسی کے ساتھ (صفحہ ۵۱۹ تک) میر کے دوسرے حالات تحقیق کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ پھر اُن کے معاصرانہ معرکوں کا ذکر ہے، غرور و نخوت، احساسِ برتری، درد و غم وغیرہ سب میر کے مزاج و مذاق میں داخل تھے۔ خداجانے تسلیم و رضا کا جذبہ (صفحہ ۵۲۵) اُن کی فطرت میں ودیعت تھا، یا مجبوراً اختیار کیا گیا، نکات الشعراء اور اُن کے واقعات سے اس جذبے کی تائید شاید مشکل سے ہو سکے۔[1] ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس کی مدد سے ہم میر کے مزاج، کردار، شخصیت، اندازِ فکر، معیارِ شاعری، تنازعات اور معرکوں وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں" (صفحہ ۵۳۳)۔ لیکن فن کے لحاظ سے یہ تذکرہ معیاری نہیں ہے (صفحہ ۵۳۳)۔ تاہم اس کے محاسن بھی بیان کیے گئے ہیں اور اس کے مطالعے سے میر کے نظریۂ شعر کی وضاحت بھی کی گئی ہے (صفحہ ۵۳۸)۔ پھر فیضِ میر اور ذکرِ میر کتابوں کی تفصیل بھی دی گئی ہے اور میر کے کلام کے مختلف مجموعوں کا ذکر بھی ہے اور اسی جائزے پر باب ختم ہوتا ہے۔[2]

---

[1] میر کی خوردہ گیری، طرفداری، احساسِ برتری، بلکہ غلط بیانی وغیرہ کا ذکر بھی صفحات ۵۳۰ تا ۵۳۱ – ۵۴۶ وغیرہ میں ملتا ہے۔

[2] صفحہ ۵۵۲ میں فارسی مصرعے غالباً اس طرح رہے ہوں گے:—

ع ہر کسے روے بسوی تو دارد

ع غلط کردم کہ رشتم بجز از خود

اور صفحہ ۵۵۵ میں چشم رکھنا (چشم داشتن = امید رکھنا) میں ابہام ہے۔—

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فصل پنجم کے تیسرے باب میں میرؔ کی شاعری (بالخصوص غزل) پر تفصیل سے بحث ہوئی ہے اور کئی مقامات پر بہت خوب تجزیہ کیا ہے۔ ایک جگہ اس طرح تجزیہ کیا ہے:

"میرؔ کے کلیات کو پڑھتے وقت ہمیں طرح طرح کی کیفیتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کبھی وہ ہمیں غم زدہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ہمارے غموں کا تزکیہ کر دیتا ہے، کبھی وہ ایسی سچائی کا شعور ہمیں دیتا ہے جس سے شاید ہم واقف تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میرؔ نے ہمیں واقف کرایا ہے۔ کبھی ہم اس سے اُکتا جاتے ہیں لیکن ان سب کیفیات کے ساتھ میرؔ کے شعر ہمارے ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر ہمیں بدلتے رہتے ہیں اور جب کلیات ختم ہو جاتا ہے تو ہم سیکڑوں اشعار نہ صرف منتخب کر چکے ہیں بلکہ احساس و جذبہ کی دنیا میں ہلچل مچا کر وہ ہمارے گونگے جذبوں کو زبان بھی دے دیتے ہیں اور ہم خود کو پہلے سے زیادہ باشعور اور زندہ انسان محسوس کرنے لگتے ہیں" (صفحہ ۵۷۳)

ایک اور جگہ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ:

"میرؔ ہمیں رُلاتے نہیں ہیں بلکہ غم کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ غم کے حُسن اور حُسنِ بیان سے ہم خود غم کو بھول جاتے ہیں جیسے کسی بدنما چیز کی خوبصورت تصویر دیکھ کر ہم اُس کی بدنمائی کو بھول جاتے ہیں۔۔۔ میرؔ کے غم کا اثر ایک کامیاب ٹریجیڈی کا سا ہوتا ہے۔ جیسے ٹریجیڈی میں ہم زندگی کے المیے کو پہلے تو شدت سے محسوس کرتے ہیں لیکن جب ہم رونے کے قریب پہنچتے ہیں تو فن کا توازن، طرزِ حُسن اور اُس کا راگ آہنگ ہمیں اس غم انگیز المناک کیفیت سے بچا لیتا ہے" (صفحہ ۵۸۵)۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے غم اور عشق کے رشتوں پر بحث کی ہے اور اُن انسانی رشتوں کا ذکر بھی کیا ہے جو میرؔ کی شاعری کی "تجربہ گاہ" ہیں (صفحہ ۵۸۹)۔ اُن کی انا پرستی، بددماغی، کم آمیزی اور بے نیازی بھی اُن کی شاعری کے عوامل تھے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ "جب وہ اپنے تخلص کے ساتھ خود کو مخاطب کرتے ہیں تو اُن کا تخلص، زندگی کا استعارہ بن جاتا ہے" (صفحہ ۵۹۱)۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "میرؔ کی شاعری میں قدرتی مناظر اُن کے جذبے کا حصہ بن کر آتے ہیں" (صفحہ ۵۹۲) سہلِ ممتنع، محاورات کا استعمال، اردو آمیز تراکیب، طویل بحور، ایجاز و اختصار، موسیقیت آمیز توازن وغیرہ بھی میرؔ کی شاعری کے خد و خال ہیں۔ گویا مجموعی محاسن کی وجہ سے "میرؔ دنیا کے اُن شاعروں میں سے ایک ہیں جو ہر ملک اور ہر ادب میں عظیم سمجھے جاتے ہیں" (صفحہ ۶۰۳)۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے میرؔ کی زبان اور مختلف اصنافِ سخن پر بھی بحث کی ہے اور اپنی اس جلد کے حصۂ اوّل کو ختم کر کے دوسرے حصے کے مطالعے کی دعوت دی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جلد دوم کے دوسرے حصّے کا آغاز فصل پنجم کے چوتھے باب سے ہوتا ہے جو سوداؔ سے متعلق ہے۔ سوداؔ کے حالات سے متعلق بھی ڈاکٹر صاحب نے تحقیق فرمائی ہے۔ مختلف تذکروں کے اقوال کو پرکھنے کی کوشش کی ہے اور سوداؔ کے مختلف مقامات کے قیام کے سنین متعین کیے ہیں[1]۔ سوداؔ نے فارسی میں خانِ آرزو سے اور اردو میں شاہ حاتم سے مشورہ کیا تھا (صفحہ ۶۵) بلکہ خانِ آرزو ہی کی تجویز پر انھوں نے اردو میں شاعری شروع کی تھی (صفحہ ۶۵)۔ بہت سے اور واقعات بھی لکھے ہیں۔ مثلاً:

میرؔ نے جب نکات الشعراء (۱۱۶۵ھ) مکمل کیا تو سوداؔ کو یقین کے مقابلے میں کم تر ظاہر کر کے یہ بھی لکھ دیا کہ انھیں ملک الشعراء کہنا چاہیے اور قائمؔ جو سوداؔ کے شاگرد تھے یہ بھی لکھتے ہیں کہ "نامدار بادشاہوں کی قبولیت اور عالی مرتبت سلاطین کا تقرب اسے (سوداؔ کو) حاصل ہوا اور بالفعل ملک الشعراء کے خطاب کا، جو شاعروں کا بلند درجہ ہے، اعزاز و امتیاز رکھتا ہے" (صفحہ ۶۵۵)

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ دونوں خانِ آرزو کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، پھر بھی میرؔ نے اپنے دیوان اوّل میں اُن کو جاہل کہہ دیا اور سوداؔ نے اس سخت کلامی کا جواب صرف یہ دیا کہ:

ع وہ ان طرزوں سے کیا واقف، وہ یہ انداز کیا سمجھے! (صفحہ ۶۶)

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سوداؔ کے دوسرے واقعات لکھے ہیں۔ اُن کی ذہانت، قادر الکلامی، علمیت اور صلاحیت سب کچھ مسلّم ہے۔ ایسے باکمال شعراء کم ہوتے ہیں۔ نثر اور نظم دونوں میں اُن کی تصانیف موجود ہیں اور غالباً اُن کی کوئی تصنیف غیر مطبوعہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے پھر میرؔ اور سوداؔ کے چار قریب المعنی اشعار لکھ کر اُن کا موازنہ اور مقابلہ کیا ہے۔ مزاج اور مذاق دونوں شاعروں کا مختلف ہے اس لیے اُن میں فرق پایا جانا بھی لازمی ہے۔ پھر سوداؔ کے وہ اشعار بھی پیش کیے ہیں جو لکھنؤ کے دبستان سے زیادہ قریب ہیں (صفحہ ۶۸) اور جو ناسخؔ کے دور کے معلوم ہوتے ہیں۔

غزل کے علاوہ قصیدہ سوداؔ کا شاہکار ہے۔ اس صنف[2] میں غالباً اردو کا کوئی شاعر اُن کے پایے کا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سوداؔ کی زبان و بیان پر بھی تفصیل سے بحث کی ہے اور صحیح فرمایا ہے کہ "وہ ہمیں ایک پیدائشی شاعر نظر آتے ہیں جنھیں شعر گوئی کا بے پناہ ملکہ ودیعت ہوا تھا۔ اُن کے لیے شعر کہنا وہ سانس لینے اور بات کرنے کا مترادف تھا" (صفحہ ۷۰)۔

فصل پنجم کا پانچواں باب خواجہ میر دردؔ سے متعلق ہے۔ اس باب میں بھی تحقیق کے ساتھ دردؔ کے حالات درج ہیں۔ اُن کی مختلف تصانیف کے شواہد سے اُن کے سنین بھی متعین کیے ہیں۔ اور ان کے سماع[3] کا

۱۔ بالاپور (برار) کی خانقاہ نقشبندیہ میں سوداؔ کے کلیات کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔ مجھے اب اُن کا سال کتابت یاد نہیں لیکن ایسا خیال ہے کہ وہ دونوں نسخے ۱۱۹۵ھ کے لگ بھگ تیار ہوئے تھے۔ مومنؔ کے شاگرد آسیؔ نے مطبع مصطفائی سے ۱۲۷۰ھ میں کلیات سوداؔ شائع کیا تھا۔ لیکن ان کی تصحیح کے باوجود اس کی تصحیح کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

۲۔ راقم الحروف کا ایک حقیر سا مضمون "سوداؔ کے قصیدے" (ادبی جائزے) مادح اور ممدوحین دونوں کے متعلق مفید ہو سکتا ہے۔

۳۔ سماع کے متعلق ایک غلط فہمی عام ہے کہ مزامیر اس کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔ بغیر مزامیر کے، حمد و نعت اور عشق الٰہی سے متعلق اشعار ایک پاکیزہ شخص سے سننا ہر سلسلے میں جائز ہے۔ البتہ اس فعل کو بھی لازم نہیں سمجھنا چاہیے، صرف جائز ہے۔ حضرت بہاء الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ "نہ این کار می کنیم و نہ انکار می کنیم"۔ دیکھیے مکتوب ۴۲ (مکاتیب شیخ ابو یافع اللہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذکر بھی ہے۔ درد کے اوصاف میں قدرت اللہ شوق کا یہ قول ہی کافی ہے کہ "ترک، تجرید و استغنا میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا" (صفحہ ۲۲۸)۔ اور "استقلال اُن کے مزاج میں ایسا تھا کہ دلی کے اُجڑنے پر جب عزت دار بے عزت ہو گئے اور اہلِ کمال ایک ایک کر کے دلی چھوڑ کر باہر جانے لگے، وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور ساری تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔۔۔ زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا۔ جو وقت بچتا وہ تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا جس کا اندازہ اُن کی تصانیف کی تعداد اور حجم کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے" (صفحہ ۲۳۰)۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے درد کے "طریق محمدی" کی تفصیل دی ہے اور اُن کے "وطن در سفر" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "برِ عظیم کی تاریخ تصوف میں درد کو متفکر صوفیہ کی اُس صف میں شامل کرنا چاہیے جس میں داتا گنج بخشؒ، خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، امیر الدین اعلیٰؒ اور مجدد الف ثانیؒ وغیرہ کھڑے ہیں" (صفحہ ۷۴۱)۔ اس موضوع پر زیادہ کچھ عرض کرنے کے بجائے خود ڈاکٹر صاحب ہی کا قول نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "وہ لوگ جو تصوف پر فراریت کا الزام لگاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ تصوف نے ہمیشہ دورِ زوال میں مقبولیت حاصل کی ہے اور اس کے ثبوت میں زوالِ بغداد اور زوالِ دہلی کی مثال پیش کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ اس دور میں تصوف ہی نے انسان کے زخموں پر مرہم رکھ کر اُسے نیا حوصلہ دیا اور اس کی زندگی میں نئے معنی اور نیا مقصد پیدا کر کے اُسے اس زوال کی مٹا دینے والی پستی سے بچا لیا" (صفحہ ۷۴۱)[1]۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ "شاعری، درد کے لیے ایک قسم کی عبادت ہے۔ وہ شاعری اسی طرح کرتے ہیں جیسے مذہبی عبادت کو انہماک و خلوصِ دل سے ادا کرتے ہیں" (صفحہ ۷۴۵)۔ یہاں اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے عبادت میں شمار ہوتا ہے، درد بھی غالباً اسی نیت سے شاعری کرتے ہوں گے۔

درد نے بے شک وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مسئلے پر یہ شعر مکمل ہے:

متفق آپس میں ہیں اہلِ شہود — درد آنکھیں دیکھو باہم ایک ہیں

اسی سلسلے میں انھوں نے بکثرت صوفیانہ اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں بلکہ اُن کے خالص "مجازی" تصورات بھی عشقِ حقیقی کی غمازی کرتے ہیں۔

فصل پنجم کے چھٹے باب میں قائم، میر سوز اور میر اثر کا ذکر ہے۔ یہ وہ شعراء ہیں جو باکمال ہونے کے باوجود، میر اور سودا کی وجہ سے زیادہ قبولِ عام حاصل نہ کر سکے۔ قائم تو درد کے اور پھر سودا کے شاگرد ہوئے۔ دہلی میں رہے۔ ملازمت کی، پھر ملازمت سے علاحدہ ہوئے تو اپنا تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ سودا سے کچھ عرصے تک بے تعلق ہوئے، پھر مل گئے اور اُن کی وفات تک اُن کے معتقد رہے۔ اُن کا بہت سا کلام جو سودا کے پاس رہ گیا تھا کلیاتِ سودا میں غلطی سے شامل ہو گیا۔ یہ تمام واقعات ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کی روشنی میں دیکھے ہیں اور اُن پر سے غلطیوں کی تاریکی کو دور کیا ہے۔ پھر ان کے کلیات اور تذکرے پر بحث کی ہے۔

---

[1] لیکن ڈاکٹر صاحب نے جلد دوم کے حصۂ اول (صفحہ ۲۰۱) میں المجاز قنطرۃ الحقیقہ کی تاویل دوسرے انداز سے کر دی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قائم کو تذکرہ نگاری میں یہ اوّلیت حاصل ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو تین طبقات میں تقسیم کرنے کی روایت قائم کی ہے جس کی پیروی دوسرے تذکرہ نگاروں نے کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ قائم کے تذکرہ "مخزنِ نکات" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جلوس عالمگیری کے چوالیسویں سال (یعنی ۱۱۱۲ھ میں) ولی دکنی، (اپنے دوست) سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی آئے تھے اور شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات بھی ہوئی تھی جنھوں نے ولی کو زبانِ ریختہ میں شعر کہنے کا مشورہ دیا تھا اور تعلیماً یہ مطلع موزوں کرکے ولی کے حوالے کیا تھا:۔

خوبیِ اعجازِ حسنِ یار اگر انشا کروں ـــ بے تکلف صفحۂ کاغذ، ید بیضا کروں " (صفحہ ۷۶) ع۱

پھر ڈاکٹر صاحب نے دیوانِ قائم کے اشعار کی نوعیت قائم کی ہے کہ اس میں یا تو ایسے شعر ہیں کہ جن کا ایک ہی مصرع جان دار ہے، دوسرا نہیں ــ یا پھر دونوں مصرعے جاندار ہیں ـــ یہ ایک لطیف تقسیم ہے جس سے شاید ہر شخص اتفاق نہ کر سکے گا۔ بہرحال، قائم کا مزاج میر یا مومن یا غالب جیسا تو نہیں ہے ــ خود سودا سے بھی مختلف ہے اور یہ اختلاف کب اور کس میں نہیں رہا ہے! ڈاکٹر صاحب نے خود بھی، قائم کے اچھے اشعار نقل کیے ہیں (صفحہ ۲۸۳ تا ۲۸۵) جن سے کون متاثر نہ ہوگا؟

قائم کی دوسری اصنافِ سخن اور اُن کے لسانی تجزیے کے بعد میر سوز کا ذکر آتا ہے۔ اُن کے حالات اور تصانیف کی تحقیق کے بعد ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ " سوز کی شاعری پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص مزے لے لے کر، کھلے بندوں اپنے عشق اور محبوب کی باتیں کر رہا ہے" (صفحہ ۲۹۸) ۔ ع۲

پھر خواجہ میر اثر کا ذکر ہے کہ "چھوٹا پیڑ بڑے پیڑ کے سایے میں دب کر رہ جاتا ہے" (صفحہ ۲۹۹)۔ قائم، سوز اور اثر اس دور میں "چھوٹے پیڑ" ہی تھے۔ اثر کی مثنوی نگاری پر بڑی تفصیلی بحث ہے کہ اس میں بہت سی خامیوں کے باوجود ایسی خوبیاں بھی ہیں جن سے اُن خامیوں کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اُن کی مثنوی "خواب و خیال" تمام مثنویوں سے الگ ہے۔ اس کا طرز مثنوی کا سا ہے بھی اور اس سے مختلف بھی ہے۔ جدید دور میں اس کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایک شاعر کے عشق میں گم ہو جانے اور پھر تزکیے کے ذریعے ارتفاع حاصل کرنے کی داستان موجود ہے ـــ اس مثنوی کے طرزِ ادا نے جہاں میر درد کی روایتِ غزل کو آگے بڑھایا ہے وہاں غالب کی "کوئی امید بر نہیں آتی" والی غزلوں کے مزاج میں رنگ بھر کر اُسے داغ تک پہنچایا ہے۔ بغیر فارسی و عربی الفاظ کا یہ طرزِ ادا ہمارے اپنے دور کے لیے اندازِ بیان کی روایت کا حصہ ہے" (صفحہ ۳۰۸) ع۳

ع۱ ڈاکٹر صاحب نے پہلی جلد کے صفحات ۵۳۰ - ۵۳۶ میں ولی کے ایسے حالات درج کیے ہیں ـــ

ع۲ "میر سوز ـــ آثار و افکار" ایک عمدہ مقالہ سندھ یونیورسٹی میں سردار احمد صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا افسوس کہ اب تک وہ شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے سوز کی "ادا بندی" کی تحریک کا ذکر بھی کیا ہے (صفحہ ۲۹۷) یہ بھی معلومات میں ایک اضافہ ہے۔

ع۳ ڈاکٹر صاحب نے بہت خوب جائزہ لیا ہے۔ لیکن شاید میر تقی میر کے یہاں بھی سہل ممتنع کی روایت اسی انداز کی ہے:

جو مجھ دیکھنے کو آتا ہے ــ پھر مجھے دیکھنے نہیں آتا
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ــ لہو آتا ہے جب نہیں آتا
نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا ــ پر ہمارا نہ مدعا سمجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فصل پنجم کے ساتویں باب میں میر حسن کا ذکر ہے۔ اُن کے حالات کی تحقیق میں ڈاکٹر صاحب نے اُن کے دیوان کے دیباچے سے خان آرزو کے قیامِ لکھنؤ کا نکتہ دریافت کیا ہے اور پھر نتیجہ یہ نکالا ہے کہ خان آرزو قریب سترہ ماہ (۱۱۶۷ھ سے اپنی وفات ۱۱۶۹ھ تک) لکھنؤ میں تھے اور اسی زمانے میں یعنی ۱۱۶۸ھ میں میر حسن وہاں پہنچے تھے اس لئے میر حسن کی ولادت ۱۱۲۹ھ میں متعین کی جا سکتی ہے۔ اُن کی زندگی کے دوسرے مراحل کا بھی ذکر ہے اور اُن کی تصانیف کا بھی[۱]۔ بالخصوص اُن کی مثنوی سحرالبیان پر سیر حاصل بحث ہے اور فرمایا ہے کہ " (یہ مثنوی) ایک ایسا شاہکار ہے جس میں وہ ساری خصوصیات یکجا ہو گئی ہیں جو ایک بہترین مثنوی میں تصور کی جا سکتی ہیں۔ اس میں ایک طرف تو مثنوی کی روایتی ہیئت کو پورے طور پر برتا گیا ہے اور دوسری طرف اس میں قصہ پن کے ساتھ وہ ترتیب و ربط، قوتِ تخیل، شاعرانہ صفات، توازن و اختصار، تہذیب و معاشرت کی اثر انگیز تصویریں، منظر کشی و کردار نگاری، سلاست و روانی، زبان و بیان کا فنکارانہ استعمال بھی ہے کہ دو سو سال گزر جانے کے باوجود یہ آج بھی اسی طرح دلچسپ، پُر اثر اور تازہ ہے۔۔۔۔" (صفحہ ۱۸۵) — 18

اسی فصل کے آٹھویں اور نویں ابواب میں جعفر علی حسرت، میر محمدی بیدار، شیخ قدرت اللہ قدرت، ہدایت اللہ ہدایت، ہیبت علی خاں حسرت، رکن الدین عشق، مرزا محمد علی فدوی، شیخ غلام علی راسخ، محمد روشن جوشش اور شیر محمد خاں ایمان کی شاعری اور اُن کے حالات کا جائزہ ہے۔ اور بہت سی نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

اس کے بعد فصل ششم شروع ہوتی ہے اور اس کے پہلے باب میں "اردو نثر" پر بحث آتی ہے۔ فرمایا ہے کہ "اس صدی میں (اٹھارہویں صدی میں) اردو تصنیف و تالیف (نثر میں) کا رُخ عوام کی طرف[۲] تھا۔ وہی اس کے مخاطب تھے اور انہی کی زبان، اظہار کا وسیلہ تھی" (صفحہ ۹۸۴) — یہی کام صوفیہ نے ابتدائی اردو کے دور میں کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کے لحاظ سے اس دور کی نثر کو (۱) تنقیدی اور علمی (۲) مذہبی (۳) تاریخی اور (۴) افسانوی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ان سب پر الگ الگ باب باندھا ہے۔

جعفر زٹلی کا ذریعۂ اظہار فارسی تھا لیکن الفاظ نے اردو کہاوتوں کو اپنے مخصوص ہجویہ اور مضحک انداز میں استعمال کیا تھا۔ سید برکت اللہ عشقی (م ۱۱۴۲ھ) نے عوارف ہندی میں (گو کہ وہ فارسی میں ہے) متعدد اردو امثال اور کہاوتوں کی صوفیانہ تشریح کی ہے۔ مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ)[۳] نے دہلی کی اصطلاحات اور وہاں کے فصحاء کا روزمرہ ایک فرہنگ کی صورت میں مرتب کیا اور گو کہ تشریح فارسی میں ہے لیکن سند کے لیے زیادہ تر اردو اشعار اور کم تر فارسی اشعار درج کیے۔ سید عبدالولی عزلت (م ۱۱۸۹ھ) کا اپنے

عـ۱ راقم الحروف کا ایک حقیر مضمون "میر حسن کی غزلیات" (ادبی جائزے) شاید مفید ثابت ہو سکے۔

عـ۲ "نوطرز مرصع" ضرور عوام کے لیے نہیں تھی بلکہ یعنی نواب شجاع الدولہ کو پیش کی گئی تھی اس لیے اس میں عبارت آرائی اور انشا پردازی ہے۔ (صفحہ ۹۸۶)

عـ۳ عزیزی ڈاکٹر نجم الاسلام کے پاس کلیاتِ شائق کا عکس (قلمی) موجود ہے جس میں طپش کے انتقال کا قطعۂ تاریخ ہے۔ تاریخ کا شعر یہ ہے:

ناگاہ صدائے زد بادردو بکا ہاتف — حالا کہ بموت آمد مایۂ سخنِ اردو

دوسرے مصرع سے ۱۲۳۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں لیکن "مایۂ سخنِ اردو" کی ترکیب غور طلب ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب ہی نے بیاضِ طپش والے مضمون میں (نقوش شمارہ ۱۰۹ ستمبر ۱۹۶۷ء) وقائع عبدالقادر خانی کی بنیاد پر یہ اطلاع دی ہے کہ طپش نے قید سے رہائی کے بعد راجہ نبی کشن Nob Kissan کے متوسل بن کر کلکتہ میں قیام کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پچھلے دنوں کلکتہ گئے تھے تو وہاں سوبھا بازار میں اسی نبی کشن (نبا کشنا) کے اخلاف کے قیام کا علم بھی ہوا۔ یہ لب کشور" (صفحہ ۱۰۰) نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے اور بھی معلومات حاصل ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ بہارِ دانش میں لارڈ منٹو، مارنگٹن، ٹیلر اور کالج کی مدح میں اشعار بعد کا اضافہ ہے۔ یہ مثنوی انہوں نے قید کی حالت میں لکھی تھی اور وہ اُس وقت انگریزوں سے بغاوت کے جرم میں سزا بھگت رہے تھے۔ کالج سے اُن کا تعلق، ملازمت کا زمانہ، کلیات کا چھپنا، ثبوت طلب ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کا ایک نسخہ کالج کے کتب خانے میں داخل ہوا تھا۔ طپش نے مرشد آباد میں شمس البیان لکھی تھی۔ اس میں مصطلحات اور محاورات کی تعداد ۲۹۰ (۲۹۴؟) نہیں ہے بلکہ ذخیرۂ شادانی کے مطبوعہ اور کلیات کے قلمی نسخوں میں تعداد مختلف ہے۔ اور یہ کہ شمس البیان کے دیباچے کی عبارت اردو میں درج ہے تو یہ صراحت کہیں نہیں ہے کہ وہ دیباچہ طپش نے پہلے فارسی میں لکھا تھا اور اب اُس کا ترجمہ اردو میں دیا جا رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اردو دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا جس میں فارسی کا اثر ضرور ہے لیکن اردو مزاج نمایاں ہے۔ مرزا علی نقی خاں الفاظ حیدر آبادی (م ۱۱۹۵ھ) نے اپنے رسائل کے مجموعے پر اردو نثر میں دیباچہ لکھا لیکن اس میں ضمائر اور افعال کے علاوہ، جملے کے جملے فارسی ساخت ہی کے ہیں۔ مرزا رفیع سودا (م ۱۱۹۵ھ) کی مثنوی "سبیل ہدایت" کا دیباچہ اردو نثر میں ہے لیکن زمانے کے رواج کے مطابق اس میں عبارت آرائی ہے۔ محمد باقر آگاہ ویلوری (م ۱۲۲۰ھ) نے اپنی کئی تصانیف کے دیباچے اردو میں لکھے۔ ان میں دکنی لب ولہجہ ضرور ہے، لیکن زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ انھوں نے اپنے اردو دیوان کے دیباچے میں اقسام سخن پر بحث کرنے کے بعد "ریختہ گویوں" کو بعض علمی مشورے بھی دیے ہیں جن سے اُن کے فنی اور تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ان کے کچھ بعد حبیب غلام علی عشرت بریلوی (م ۱۲۳۶ھ) نے پدماوت (اردو منظوم) کا دیباچہ لکھا تو شمالی ہند میں ہونے کی وجہ سے فارسی عبارت آرائی کو ترجیح دی، گویا ان کی اردو بالکل فارسی اسلوب میں ہے اور تھوڑی سی بات بڑی بڑی عبارتوں میں چھپ گئی ہے۔

پھر اس فصل کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے جو مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کی مذہبی تصانیف سے متعلق ہے۔ ص 19
اور اسی سلسلے میں فضلی کی کربل کتھا پر بحث کی ہے اور اس کے مآخذ ملا حسین واعظ کاشفی (م ۹۱۰ھ) کی روضۃ الشہداء کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسے اٹھارھویں صدی عیسوی کے کئی شعراء نے نظم کیا تھا۔[۲]

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ کریم الدین نے اپنے تذکرے میں کربل کتھا کے طویل اقتباسات درج کیے ہیں۔ اسی وجہ سے پہلی بار اس کتاب کا اور اس کے مصنف فضلی کا علم ہوا ہے اور گارساں دتاسی کو بھی کریم الدین ہی کے ذریعے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔[۳]

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "وہ واعظ کاشفی کی روضۃ الشہداء میں دس باب ہیں اور ایک خاتمہ ہے۔ لیکن کربل کتھا میں فضلی کے دیباچے اور مقدمے کے علاوہ فاتحات بھی شامل ہیں جو اردو نثر میں ہیں۔ دیباچہ اور مقدمہ تو خود فضلی کا ہے۔ لیکن فاتحات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا یہ بھی اس فارسی خلاصے میں شامل تھے جس سے فضلی نے ترجمہ کیا ہے۔ یا یہ خود فضلی کا اضافہ ہیں" (صفحہ ۱۰۳۲)۔

ڈاکٹر صاحب نے اس ترجمے میں برصغیر کے عمومی ماحول کی نشان دہی بھی کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

کربل کتھا کا موضوع تو واقعات کربلا ہیں۔ لیکن پوری کتاب کا عمومی ماحول خالص برعظیم (یا برصغیر!) کا ماحول ہے۔ شادی بیاہ، رسم و رواج، آداب محفل، لباس و زیور، رہن سہن، کھانا پینا اور نشست و برخاست کے طور طریقے وہی ہیں جو برعظیم (برصغیر) کے ساتھ مخصوص ہیں۔ (صفحہ ۱۰۳۵)۔ ڈاکٹر صاحب نے اس عمومی ماحول کی نشان دہی ایک دو جگہ سے کی ہے اگر پوری کتاب سے اس عمومی ماحول کو یکجا کرایا جائے تو اُس صدی کے معاشرے کے متعلق بہت سی مفید معلومات فراہم ہو سکتی ہیں۔ اور اس موضوع پر کام کرنے والوں کو بہت کچھ سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی لسانی خصوصیات بھی بیان کی ہیں اور شمال و جنوب کی ایسی خصوصیات کی مماثلت بھی

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ اس دیباچے میں محمد باقر آگاہ نے اپنے معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے لیکن میر کا ذکر نہیں ہے (صفحہ ۱۰۱۱)۔

۲۔ علیم شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں کئی دکنی شعراء کی روضۃ الشہداء نام کی مثنویوں کا ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف نے جنوری ۱۹۴۰ء کے رسالہ معارف (اعظم گڑھ) میں ولی ویلوری کی روضۃ الشہداء کی تفصیل بیان کی تھی کہ وہ ۱۱۵۱ھ میں تصنیف ہوئی تھی۔ مکرم لطیف الزماں صاحب نے بھی ایک دکنی شاعر کی قلمی روضۃ الشہداء مجھے عنایت کی تھی (شاعر کا نام اب یاد نہیں)۔ وہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم نے مجھ سے مطالعے کے لیے لی تھی لیکن اُن کا انتقال ہو جانے سے وہ انھی کے گھر رہ گئی۔

۳۔ فضلی کی کربل کتھا پر تحقیقی مضمون ڈاکٹر نجم الاسلام نے نقوش (جولائی ۱۹۷۳ء) میں شائع کیا تھا۔ گارساں دتاسی (بلکہ غرسین دتاسی جیسا کہ خود اس نے اپنے مرتب کردہ دیوان ولی میں اپنا اسم اسی طرح نام لکھا ہے) نے اپنی تاریخ کے دوسرے ایڈیشن میں کریم الدین کے تذکرے سے مصنف کے متعلق تفصیلات حاصل کی ہوں گی۔ یہ تذکرہ ۱۸۴۸ء میں چھپا تھا تو اس میں ۱۸۵۰ء میں چھپنے والی دہ مجلس کے اقتباسات کس طرح ہو سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ مجلس کسی اور کی ہو، فضلی کی نہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بتائی ہے۔ نثر کی تقلید میں زیر، زبر اور پیش کے بجائے جو ی، الف اور واو کا استعمال عام تھا اس کا ذکر بھی آیا ہے ع۱
اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شاہ معین الدین حسین علی (م ۱۱۹۹ھ) کی فتوح المعین ع۲ کی کتاب کی تفصیل دی ہے کہ وہ تصوف سے متعلق "جامِ جہاں نما" کا آزاد ترجمہ ہے اور اُس میں اردو (!) اصطلاحات تصوف (صفحہ ۱۰۴۲) ہیں
پھر تصوف اور دین کے رشتے سے شاہ مراد اللہ کی تفسیر مرادیہ کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ صرف تیسویں پارے کی تفسیر ہے اور اس کا تاریخی نام "خدائی نعمت" (۱۱۸۵ھ) ہے ع۳ اور اس میں عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے اسی لیے زیادہ مقبول ہوئی۔ پھر شاہ رفیع الدینؒ (م ۱۲۳۳ھ) کے اردو ترجمہ قرآن پاک اور تفسیر رفیعی کا ذکر ہے ع۴ اور ان کی نثری خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ شاہ عبدالقادرؒ (م ۱۲۳۰ھ) حضرت شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے تیسرے فرزند تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی شاہ رفیع الدینؒ کے تحت اللفظ ترجمے کے بعد یہ ضرورت سمجھی کہ "ترکیب ہندی" کے مطابق قرآن پاک کا وضاحتی ترجمہ کیا جائے جو مختصر تفسیر بھی ہو۔ موضح قرآن اس تفسیر کا تاریخی نام ہے یعنی یہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوئی ع۵ ڈاکٹر صاحب نے اس تفسیر میں سے بہت سے محاورات جمع کیے ہیں (صفحہ ۱۰۵۹-۱۰۶۰) - اسی کے ساتھ حکیم محمد شریف خان (م ۱۲۱۶ھ) کے ترجمہ قرآن پاک کا ذکر ہے جس کا ایک اقتباس مولانا احسن مارہروی مرحوم کی "نمونہ منثورات" میں سب سے پہلی بار درج ہوا تھا (اس ترجمے پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے)۔

پھر عیسائی مبلغین کی بعض مساعی کا ذکر ہے کہ انھوں نے سترھویں صدی عیسوی کے اوائل سے کس طرح برصغیر کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ یہاں کی لغت اور صرف و نحو پر بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ سب اسی تبلیغی سلسلے کی وجہ سے ہے۔

ہندو مت پر بھی اسی زمانہ میں لکھا جانے لگا۔ مول رام نے ۱۱۹۵ھ میں بھگوت گیتا کی دانش و حکمت کی باتیں اردو میں لکھیں۔ پروفیسر محمد سلیم صاحب نے سب سے پہلے اس مخطوطے کا ذکر کر کے اس کی خصوصیات بتائی تھیں۔ ہندی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت سے اس کا مفہوم کم سمجھ میں آتا ہے اور یہی خصوصیت ہندو مت کی بہت سی دوسری کتابوں کی ہے جو نول کشور پریس سے شائع ہوئی ہیں اور اردو رسم الخط میں ہیں ع۶ گو کہ بعد میں شائع ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اس فصل کا آخری باب آتا ہے جو افسانوی تصانیف سے متعلق ہے۔ تمہید میں عام داستانوں اور افسانوں کے پلاٹ کی خصوصیات بیان کی ہیں اور نواب عیسوی خان کی داستان "قصۂ مہر افروز و دلبر" سے بات شروع کی ہے پہلے اس مصنف کے حالات کی تحقیق کی ہے پھر اس قصے کی تفصیل دی ہے۔ کرداروں کے نام عام طور پر علامتی ہیں (جیسے سب رس میں ہیں) اور اس میں جزئیات بھی اسی پسند کے مطابق ہیں۔ زبان پر بھی بحث کی گئی تاکہ اس کے زمانے کی شناخت ہو سکے۔

ع۱ ایسا استعمال اب بھی بعض بزرگوں کی تحریر میں دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے (صفحہ ۱۰۴۰) لکھا ہے کہ بعض کتابوں میں سو (سو کے عدد کے لیے) استعمال ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تاریخ کا مادہ "اٹھارہ سے بھتّر" بھی تاریخ بن گیا ہے۔

ع۲ صفحہ ۱۰۴۱ میں اس کا نام فتوح المعین ہے لیکن صفحہ ۱۰۴۲ میں دو جگہ اور حاشیہ نمبر ۱۸ میں فتح المعین چھپ گیا ہے۔

ع۳ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ شاہ مراد اللہ سنبھل ضلع مراد آباد کے محلہ میاں سرائے کے رہنے والے تھے (صفحہ ۱۰۴۴) - یہ قیاس ہوگا، کیونکہ اس جگہ نواب امین الدولہ رہتے تھے۔ شاہ مراد اللہ تو اپنا وطن ترک کر کے بنگال چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے ایم اے کے مقالے (۱۹۶۰ء) اور پی ایچ ڈی کے مقالے میں اور "تین نثری نوادر" میں شاہ مراد اللہ کی تفسیر پر تفصیل سے بحث کی تھی۔ اور اسی میں اس کے غیر مطبوعہ دیباچے کا پہلی بار ذکر کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد مسعود صاحب نے اپنے مقالے "اردو میں قرآنی تراجم و تفاسیر" میں بھی بہت سی اہم چیزیں درج کی ہیں۔ راقم الحروف کا مقدمۂ وحی منظوم (سیماب اکبر آبادی) بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ع۴ شاہ رفیع الدینؒ کی تصانیف کی تفصیل پروفیسر محمد شفیع مرحوم کے مقالات جلد چہارم میں ہے۔

ع۵ ڈاکٹر نجم الاسلام کے مقالہ "دبستانِ دہلی کی نثر" میں موضح قرآن پر تفصیلی بحث ہے۔

ع۶ مثلاً جوگ بششٹھ (دوسری جلد) اس طرح شروع ہوتی ہے۔ بالمیک جی کہتے ہیں کہ ہے بھاردواج الیتم پر کرن کے جواب تم نے سن سمان پرکرن سنو جس کے جاننے سے تم نروان پد کو پراپت ہوگے۔ بڑے آنم بھن منیشور نے سری رام چندر جی سے کہے ہیں۔۔۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی دور سے متعلق تحسین کی نوطرزِ مرصع بھی ہے۔ اس کے قصوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "تحسین نے نواب شجاع الدولہ کی وفات سے پہلے نوطرزِ مرصع کا ایک قصہ لکھا تھا جس کا ثبوت اُن مخطوطات سے بھی ملتا ہے جن میں صرف پہلے درویش کی داستان ملتی ہے ۔۔۔۔۔ ان مخطوطات کے بعد ہماری نظر وقائع عبدالقادر خانی پر پڑتی ہے جس میں تحسین کا ذکر دو جگہ آیا ہے" (صفحہ ۱۰۹۶) ع۱

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے قصوں کا ذکر بھی کیا ہے جو نوطرزِ مرصع سے متاثر ہوئے ہیں۔ پھر اس کے اسالیب کا ذکر ہے اور چونکہ ان کے "مزاج" میں فرق ہے (صفحہ ۱۱۰۷) تو ظاہر ہے کہ قلم میں بھی فرق پیدا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ دور وہ ہے کہ برِ عظیم (برِ صغیر؟) پر انگریزوں کی حکمرانی کم و بیش قائم ہو چکی ہے بادشاہ، نام کا بادشاہ رہ گیا ہے اور اُس کی بادشاہت، کمپنی بہادر کی محتاج ہے۔ ہمارا روایتی طرزِ احساس اس نئے تصورِ حقیقت کے پھیلنے کے ساتھ دم توڑ رہا ہے۔ تحسین اس روایتی اسلوب کا دامن تھامنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن نوطرزِ مرصع گواہ ہے کہ یہ دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے ۔۔۔" (صفحہ ۱۱۰۸) ۔ اس کے بعد مہر چند مہر، شاہ عالم ثانی اور شاہ حسین حقیقت کے قصوں کا ذکر ہے اور ان پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور آخر میں ایک اجمالی جائزہ ہے کہ :-

"اردو نثر جس کا مطالعہ ہم نے پچھلے صفحات میں کیا ہے، فورٹ ولیم کالج کے وجود میں آنے سے پہلے لکھی گئی ہے۔ پہلے اردو نثر کا عام رجحان مرصع و مسجع انشا پردازی کی طرف تھا، پھر رفتہ رفتہ سادگی کی طرف ہو گیا۔ نوطرزِ مرصع کے مخاطب خواص تھے۔ لیکن تفسیر مرادیہ کے مخاطب عوام تھے۔ موضح قرآن اور عجائب القصص کے مخاطب عوام و خواص دونوں تھے، اس لیے ان کی نثر عام فہم، سادہ اور بول چال کی زبان سے قریب ہے۔ عام زبان میں نثر لکھنے کا یہ رجحان اٹھارویں (اٹھارہویں) صدی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے اور انیسویں صدی میں عام رجحان بن جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی پرانے رجحانات کے دم توڑنے اور نئے رجحانات کی پیدائش کی صدی ہے۔ جو کچھ اُس صدی میں ہوا اُس کی واضح صورت انیسویں صدی میں نظر آتی ہے۔ حال کا ماضی سے اور مستقبل کا حال سے یہی رشتہ ہے اور اسی رشتے سے زندگی کا تسلسل قائم ہے۔" ۔۔۔ تمت بالخیر

ع۱ ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب نے رسالہ صحیفہ (لاہور ۔ اپریل ۱۹۶۸ء) میں گربہ نامہ کے سلسلے میں وقائع عبدالقادر خانی کے ان دو مقامات کا ذکر کیا تھا جہاں تحسین کا ذکر آتا ہے بطور حاشیہ میں لکھا ہے کہ "مولوی عبدالقادر رام پوری، جن کے وقائع کا ترجمہ علم و عمل کے نام سے چھپ چکا ہے، نہ صرف علی الدین خان مراد آبادی اور اُن کے خاندان سے بخوبی واقف تھے بلکہ منشی مشرف علی خان پسرِ تحسین سے بھی واقف تھے۔ مراد آباد میں مولوی عبدالقادر رام پوری کی سسرال تھی اور وہ اپنی عملی زندگی کے ابتدائی دور میں مراد آباد میں رہتے تھے۔ اسی قیام مراد آباد کے دوران میں انہیں منشی مشرف علی پسرِ تحسین سے بھی واسطہ پڑا تھا، جو اُس زمانہ میں کمشنری بورڈ متعلقہ علاقہ مراد آباد کے انگریز حاکم کے منشی تھے۔ اسی ذاتی واقفیت کی بناء پر مولوی عبدالقادر رام پوری کا انکشاف درست ہونا چاہیے۔ اور یہ جو مولوی عبدالقادر رام پوری نے لکھا ہے کہ چہار درویش میں سب منثور کلام علی الدین خان مراد آبادی کا ہے، تو اس سے شاید یہ مراد ہو کہ باقی ماندہ حصہ لکھنے کے علاوہ علی الدین خان نے تحسین کی لکھی ہوئی داستانِ اول پر بھی نظرِ ثانی کی اور غالباً دینی تقشف کی بناء پر علی الدین خان نے قصے کو اپنی طرف منسوب کرنا پسند نہ کیا۔"

(تاریخ ادب اردو جلد اول و دوم مؤلفہ ڈاکٹر جمیل جالبی پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کا غیر مطبوعہ مقالہ)

© rasailojaraid.com